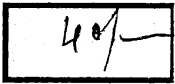


نچا ہوا الیم

اقبال متین

نصرت پبلشرز - وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ ۳

”فجيت“:



اقتساب

میرے بابا مرحوم کے نام

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نصرت پبلشرز۔ وکٹوریہ اسٹریٹ۔ لکھنؤ۔

کتابت:۔ وقار رضوی
مطبع:۔ نظامی پریس
بار اول:۔ چھ سو
جون ۱۹۷۲

فہرست

ایک پھول ایک تتلی

۹

بچھلا دروازہ

۱۸

شعورِ سفر منزل

۲۰

پانی کے چراغ

۴۹

ساحی

۸۱

تین مسافر

۱۰۵

کینڈل کالونی

۱۱۴

اندھیروں کی لاج

۱۳۱

کتاب سے کتبہ تک

۱۵۷

شکن در شکن

۱۸۴

پچور

۲۰۳

نچا ہوا البم

۲۱۷

بہادر

۲۳۰

ایک سوال

۲۳۷

سنگ آستان

۲۴۴

ایک بھول، ایک تیشی

بہتر زمین پر بچو اور پڑے یا بوسلا دھاڑ بارش ہو، جب کو نیل ہی نہیں بچوئے
 ئی تو پھر کلی کا جھکنا معلوم رضینہ چچی بس ایسی ہی ایک بھر سی زمین تھیں۔
 سوکھی ساکھی دھرتی کی طرح چچا کے قدموں کے تلے بھی رہتیں۔ کٹے ہوئے
 نصیحت کے سہکے تھنہ بھی ہوتے تو کوئی دیکھ سمجھ کر قدم رکھتا کہ مبادا اپنا پیر نہ جمنی
 ہو جائے یا پھر زندگی کی رسمساہٹ ہی رہے۔ نئے نئے ہرے ہرے پودے
 رادل کی طرح سینہ تانے کھڑے ہوں تو پھر زندگی کو کچل دینا کوئی آسان کام
 میں ہوتا۔ اس لیے اگلے والے قدم خود ہی پیچھے ہٹ سکتے تھے۔ لیکن رضینہ چچی تو
 سسکھا سا کھا جنگل تھیں۔ چوب خشک صحرا تھیں۔ قافلہ آگ ہی لگاتا تھا نہ
 دانہ ہی ہوتا تھا۔

مخردمیاں نیکی کا روپ دھار لیتی ہیں تو نیکیاں قابلِ رحم حد تک مجبوریوں کا
پر تو معلوم ہوتی ہیں اور جب یہی مخردمیاں گناہ بن کر چھاتی ہیں تو بیچاری نیکی کو سر
پھپھانے کو اس سر تک نہیں رہتا۔

رضیہ چچی کی مخردمیاں بس نیکی بن کر رہ گئی تھیں۔ اسی نیکی جو خود نیکی سے
خون کھلتے اور خاندان سارا اس نیکی پر مر رہا تھا۔

خدمت، خدمت، خدمت۔ اپنے سے چھوٹوں کی خدمت کر رہی
ہیں برابر دادوں کی خدمت کر رہی ہیں۔ بزرگ تو بزرگ ہی ٹھہرے۔ نہ تائش
کی پروا نہ صلے کی طلب۔ نیکی تقسیم ہو رہی تھی۔ اب جس کے دامن میں بھتی گنجائش
نہ تھی سمیٹ لے، جس کی بھولی جلتی وسیع ہو بھر لے اور چچا میاں نے سب سے
زیادہ سمیٹا، سب سے زیادہ بھر لیا۔

رضیہ چچی کو چچا میاں کی بھولی بھر کر بڑی خوشی بھی تو ہوتی تھی۔ بڑا آندر
بھی تو ملتا تھا۔ لیکن بقدر محبت ہر ایک نے رضیہ چچی سے کچھ نہ کچھ لیا اور وہ
بھی کس طرح۔ خود انھیں کچھ دینے کے بہانے۔

اور رضیہ چچی دنیا بھر کا دکھ درد سینے میں پھپھائے بس نیکی بن رہی ہیں۔
اور دنیا کے ٹھاٹھیں مار تے بیکران سمت در کی موجوں پر بس ڈولتی
رہیں۔ غرق ہونے کا ڈر نہیں یا رات رات کی فکر نہیں۔

”رضو چچی، دو روز ہمارے گھر چلیے نا“ بس صبح سے شام تک کچھ
نہ کچھ کہے جاتی ہیں کبھی کبھی کوئی تیریلی تو ہوتی ہی چاہیے زندگی میں۔
اس طرح تو زندگی بجائے خود ایک ”مرد مرہ“ بن جائے گی۔“

”اور پھر تمھارے چچا کو جو تکلیف ہو گی۔“

بس لاکھ سوالوں کا ایک جواب رضوی چچی کے پاس کاٹنے کی گولی کی طرح
ڈھلا ڈھلا یا تیار رہتا۔ وہ جس سمت میں چاہتیں ٹھٹ سے اس گولی کو
لڑھکا دیتیں۔

”رضیہ — میری ابھی سی رضوی بی بی — پانچویں کو مانجے ہیں۔ ساتویں
کو ہندی، آٹھویں کو ساہتی اور نویں کو جلوہ۔ دسویں کو پوٹھی ہو گی۔
گیارہویں کو سورج کی کرنیں اپنے ہی گھر کی چھار دیواری میں اسی طرح
محفوظ پاؤ گی جس طرح کچ بھوڑ جاؤ گی۔ جلو بھی اب۔
نواں گھر نویں کو جلوے کی کیا سوچھی بھلا۔

اماں بی کو یہ یاد ہی نہ رہا کہ وہ جو الٹی سیدھی تاریخیں بتلا رہی ہیں ان
میں جلوہ نویں کو آدھکے گا۔ شادی لٹی ابھی دور — وہ چلی گھٹیں رضیہ
چچی کو بھل دینے — کسی نہ کسی طرح انھیں بہر حال اپنے گھر لے آنا تھا۔
وہ آجائیں تو جیسے سارے گھر کی آسائشیں آجائیں۔ دلوں کو اطمینان
اور سکون حاصل ہو جاتا۔ سینے خوشیوں سے منور ہو جاتے، قلب گرم
ہو جاتے۔

چہرہ دیکھو تو ازل کی پیار معلوم ہوں لیکن اس ڈھنگ سے اس ڈھب
سے ہنسی کا نقاب سارے چہرے پر ڈال رکھتیں کہ اندر کے کرب تک کسی
کی کیا مجال جو پہونچ جائے۔

قریب میں جاتیں، دکھ ہماری میں جاتیں، جہاں اور جس وقت

جائیں اس طرح جائیں جیسے خوشی سب کی ہو تو سب کی نہ ہوئی کس کھس کی ہوئی۔ غم سب کا ہو تو سب کا نہ ہو اس کھس کا ہوا۔

ایک دن آدھ جھگڑا ہوا تھا۔ پھر سب کے سب یہ بکول بھاگ جاتے کہ بڑے چاد اور لکڑی سے بڑی محبت اور پیار سے انھیں نے آئے تھے کہ کچھ خاطر کریں، کچھ مدارات ہو۔

لیکن رخصتی چچی نے دیر و حرم کی ساری نیکیاں پڑھیں باند رکھی تھیں۔ اب وہ آجیتہ سے پلو کی گرہ کھولتیں اور اچالے سے بکھر جاتے۔ یہ اچالے سارے کے سارے ان کی ذات کے لیے بالکل نہیں تھے۔ وہ تو بس آنکھ بند کیے موتیوں کی طرح نیکیاں بکھیرتی تھیں۔ اچالے کر دینے والوں نے انھیں صرف اندھیرے دیے۔ لیکن انکے چہرے کی ہنسی نہ گئی۔ سو نہ گئی۔ مضحک سے چہرے پر دکھتی ہوئی ہڈیوں پر، جھکی ہوئی کمر پر اکھوں نے کبھی غم کی برجھائیں پڑنے دی، نہ محنت پر ٹھکن ٹھوس کی نہ خاندان بکھر کا بوجھ اٹھانے سے گریز کیا۔

صبح اٹھتیں، الٹی سیدھی پان کی گھوری منہ میں کھولتیں لیتیں۔ کمر اس طرح سی بھی کرتیں جیسے آنکھیں میچ کر طاقت کے انکیشن کو ادھی ہوں اور کام میں جٹ جائیں۔ پھر سارے گھر والے ہمان بن کر بیٹھ رہتے۔ رخصتی چچی میزبان بنیں ہر ایک کا خیال رکھتی پھرتیں۔ ”اجو نے کھانا نہیں کھایا۔ اچو نے چائے نہیں پی۔“ میاں کے لیے پانی تو گرم کر دیا ہوتا ہوا، وہ اب اٹھتے ہی ہوں گے۔ یہ باندیاں آنکھن میں اس طرح کیوں پھیلا رکھی

ہیں۔ الگنی پر یہ ڈھیر سے کپڑے یوں نہیں رکھ سچوڑتے۔ لاؤ میں
سمیٹ لوں۔

”اما جی سن رہی ہو۔۔۔ لیکن اما جی کان میں تیں ڈالے بیٹھ رہتیں۔
اور رخصتی چچی خود ہی سودے سلف کا حساب جوڑنے میں مانتھا چچی
کرتی رہتیں۔

بچے باپے تنگ کرتے سوا لگ۔۔۔ مانگیاں اڑن کھانیاں بتاتیں
اور یہ سب کو بٹھاتی پھرتیں۔۔۔ سبک پہلے جاتیں اور سبک بعد سوتیں۔۔۔
ساجو بھٹی اچالے لکھننا اور رات گئے اندھیر سے سٹینا۔

منوں بھاری مشین کا ایک پرزہ بھی ڈھیلہ ہو جاتا تو ساری مشین ٹھپ
ہو کر رہ جاتی لیکن رخصتی چچی ایسی مشین تھیں کہ کل پرزہ سے جھڑتے رہیں۔
چولی چول ہل کر رہ جائے، انجر بھنر ڈھیلہ ہو جائے۔ لیکن کسی کو کچھ خبر ہی نہ
ہوتی اور کام برابر چلتا رہتا۔

بے تیل کا پورا خ تھیں سب، نوم کی باتی۔ لیکن جلتیں بڑے دھڑلے سے
بڑھے ٹھکے سے۔

آدمی اگر اپنے آپ کو اس طرح سچ دے تو شاید دیکھنے والوں کا احسا
بے طرح مٹ جاتا ہے۔ رخصتی چچی کو سبھوں نے اپنا لیا تھا اور رخصتی چچی
سبھوں کے کام کو اپنا لیا تھا۔ اس طرح یہ ایک دوسرے کو پیار سے تھے۔
اب کون کس کو زیادہ پیارا ہوا۔ یہ آپ طے کیجئے۔

رخصتی چچی کو بجز زمین کہنا زیادتی ہی نہیں ان کی توین بھی ہے۔ اسی غور

جو خاندان بھر کے لیے صرف ابرہہ رحمت نہیں، بارانِ رحمت بھی ہو۔ ایسی عورت جس کے مزاج کے کھنڈے سائے نے اور مضحک چہرے کی نرم دھوپ نے خاندان بھر کی کھیتی ہری کر دی اس کی کوکھ سے مٹی نہ پھیلے تو کیا، کوئیل نہ پھوٹے تو کیا۔

لیکن یہ دکھ درد خاندان بھر کا تو نہ تھا۔ رضیہ بیچی کا اپنا دکھ تھا۔ رضیہ بیچی کا اپنا درد۔ رضیہ بیچی کی اپنی خوشی کبھی کسی نے دیکھی نہیں۔ رضیہ بیچی کا اپنا دکھ درد کسی نے بانٹ نہیں لیا۔

اسی لیے تو انھیں بجز زمین کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔ دودھ حمل کھڑے دونوں ہی ساقط ہو گئے۔ رضیہ بیچی پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ بنگ بنگ کر تڑپیں لیکن مولا کی مرضی میں کون جھیل ہو سکتا ہے بھلا۔

”بہتہ نہیں میں کون گناہوں کا خمیازہ بھگت رہی ہوں“

کبھی رضیہ بیچی نے ایسی بات کی بھی تو کچھ اس انداز سے کی جیسے اپنے گناہ انھیں معلوم ہیں۔ اور پھر انھوں نے کبھی ایسی بات کی ہی نہیں۔

کوئیلیں ایک نہیں دو بار پھوٹی تھیں۔ ننھے ننھے پردوں کا روپ دھانے سے پہلے سب کچھ خشک ہو گیا۔ اور اس طرح ہوا کہ ساری دھرتی بجز ہو کر رہ گئی۔

اب ان کی زندگی میں کوئی اچالے کی کرن تھی تو بس یہی کہ وہ خاندان بھر کی پیار ہی تھیں۔ چاہے جانے اور پسند کیے جانے کی خواہش آدمی کی فطرت ہے۔ پھر ایسے میں جب کہ اپنا کچھ بھی نہ رہے تو یہی دوسروں کی دی ہوئی رنجشیں

زندگی کے دکھ درد کو مسکرا کر سہن کرنے میں بڑی مدد کرتی ہیں اور اس طرح رضیہ بچی کی محرومیاں نیکی بن بیٹھی تھیں۔

بچا میاں تو ان کے دکھوائے تھے ہی۔ اس سے بھلا کس کو انکار ہو سکتا تھا۔ لیکن رضیہ بچی نے بچا میاں کو نہ صرف اپنی محبت دی۔ اپنا ایمان دیا، اپنی زندگی دی۔ مہاراضے میں ان کی محبت تک نہیں مانگی۔ کچھ مانگا بھی تو وہ صرف بچا میاں کی خوش فودی تھی۔ اور بس۔

بچا میاں خوش ہو جاتے تو رضیہ بچی کے حصے میں جیسے سارے جہاں کی نعمتیں سمٹ آتیں۔ وہ کسی معمولی سی بات پر بھی برا مان جاتے تو جیستی، جاگتی زندگی ہی میں جیسے انکی سانسیں ان سے الگ ہو جاتیں۔

اور پھر بڑی بچی کی ہٹ دھرمیوں کو رضیہ بچی نے ہمیشہ یہ جان کر سہہ لیا جیسے ہر حق بڑی بچی ہی کا حق ہو۔ ان کا اپنا تو جیسے کچھ تھا ہی نہیں اور اگر کچھ تھا بھی تو اس طرح کہ بچا میاں کی خوشی ان کا سب کچھ، بڑی بچی کی خوشی ان کا سب کچھ، یہاں تک کہ بڑی بچی کے بطن سے بچا میاں کی جو اولاد دھتی ان کی خوشی بھی ان کا سب کچھ تھی۔

بس رضیہ بچی کو یوں سمجھے جیسے نیم کا بہت بڑا اور کھٹا پیٹر ہوں۔ ننھی مٹی فاختائیں اس پیٹر کی شاخ پر آ بیٹھتیں تب بھی یہ پیٹر اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے ٹھنڈے سایوں کی شانتی دے گا۔

موٹے تانے گدھ اس پیٹر کی شاخ پر آ بیٹھیں تب بھی یہ پیٹر اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے ٹھنڈے سایوں کی شانتی دے گا۔

نہ اچھوڑی کی توصیف، نہ بروں کی تحقیق۔

اب جب کسی کا سب ہی کچھ دوسروں کی خوشی ہو تو وہ خود سے رہ ہی
کہاں جاتا ہے۔ اس لئے سچ بول چھٹے تو اب ارضیہ بیچے خود سے کچھ بھٹیں
ہی نہیں۔

ایک دن بڑی بچی کسی بات پر برم بھٹیں۔ چچا میاں کے تیر کی پکڑ ٹھیکہ
دکھائی نہ دیتے تھے۔ ٹھنڈی جنگ یکا یک بموں کے دھماکوں میں بدل
گئی تو راضیہ بیچی امن کا پیام لے کر دونوں کے درمیان کود پڑیں۔
یہ ان کی زندگی کا پہلا اور آخری وقت تھا جو بڑی بچی اور چچا میاں
کے بھیلانے ہوئے اندھیرے کو بھونٹا سا دیا لے وہ رکنے لگی تھیں۔
بڑی بچی کے پیچھے ایک دنیا تھی۔ باں بچے، ارمان، قانون سب ہی کچھ
مضاحکت کرانے والا یہ تو نہیں دیکھتا کہ لڑتے ہوئے ہاتھوں کی قوت دس
میں بھی ہے۔ وہ تو صرف اس سچائی کے بل بوتے پر آگے بڑھتا ہے جس کا
نام محبت ہے، جس کا نام اجالا ہے، جس کا نام نیکی ہے۔

اور اگر کوئی اس محبت ہی کے مٹھ پر کھٹوک دے تو۔

زور اگر کوئی اس اجالے ہی کے مٹھ پر کھٹوک دے تو۔

اور اگر کوئی اس نیکی ہی کے مٹھ پر کھٹوک دے تو۔

اور بڑی بچی نے ہی کیا۔ کہنے لگیں۔ اپنے کو بیچا تو راضیہ بی

عقد، نہ نکاح۔ دعوے برابر ہی کے ہیں۔ دو ہاتھ ٹکرائیں تو درمیان
آنے والی چیز نئی، نہ دنیا کی رہے گی نہ دین کی۔ راضیہ بیچی نے ادم

ادھر آنکھیں کھما کر خاندان بھر کو اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں۔
 مجھے بلند یوں تک لے پلوا، مجھے ادب اٹھا لو۔ دنیا تو میں نے اپنی محبت
 سے جیت لی ہے۔ میرا دین کہیں سے ڈھونڈ لاؤ۔ میں نے اپنے
 بچوں کو اس دنیا میں آنے سے قبل ہی اس لیے ختم کر دیا کہ انہیں بھی ان کا دین
 نہیں ملے گا۔ ان کا خدا نہیں ملے گا۔

اب رضیہ بیچی کو کون سمجھائے کہ جس سے ساری خدائی محبت کہ
 وہ اس سے بہت بڑا ہوتا ہے جس سے صرف خدا محبت کرتا ہے۔
 اور رضیہ بیچی ایسی کوئی بات سمجھیں گی بھی تو نہیں اس لیے کہ وہ تو بھلی
 ہوئی کسی ایک بی بی بن کر رہ گئی ہیں۔ ایک ایسا روپ بن کر رہ گئی ہیں
 جو اپنا حق بھیک کی طرح مانگتا ہے۔

ایک پھول۔ ایک تتلی

پھول تو اپنی خوشبو دے دے۔

پھول تو اپنا رنگ روپ تج دے۔

نہ کاٹا بن کر بھینا آئے۔ نہ ڈنک بن کر نشر لگانا۔

پچھلا دروازہ

”نیمنی، نیمنی“

لیکن وہ جاگتی کے ساتھ جا چکی تھی۔

میں نے اس کو تلاش کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے تیسری بار جب اس کو ٹیگ (Tag) کیا تھا تو صرف اس سے وعدہ لینے کے لیے کہ وہ انٹرول میں مجھ سے ملے گی۔ ویسے میں اس کو کئی بار ٹیگ کر سکتا تھا۔ آدھ کسٹرانے ابھی ابھی اپنی دھن تبدیل کی تھی اور میرے لیے پھر موقع تھا۔ اسکے ہیکلیٹوں کی تعداد دیکھتے کے دیکھتے بڑھ رہی تھی اور یہ اس کی مقبولیت کی دلیل تھی لیکن تیسری بار جب میں نے ٹیگ کیا تھا تو جاگی نے بڑی خشونت سے مجھ دیکھا تھا شاید اس لیے کہ وہ تیسرا اسٹپ لے رہا تھا کہ میں نے آدھ کسٹرانے پر دیکھے بغیر پھر ٹیگ

کر دیا۔ یہ بات ایک صاحبک غیر اخلاقی تھے۔

اُسی وقت میں نے نینسی سے وعدہ لیا کہ وہ انٹرول میں مجھ سے ملے گی۔ وہ ابھی پوری طرح وعدہ بھی نہ کر سکی تھی کہ کسی نے مجھے ٹیگ کیا اور میں بادل ناخواستہ ہٹ آیا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ وہ جا کی نہ تھا۔

آرکسٹر اپنے پورے شباب پر تھا، اور مجھے کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ قص کی رفتار آرکسٹر اسے بھی تیز ہے۔ اس لیے کہ وہ لوگ جو قص کر رہے تھے انھیں زندگی اپنا حسن، اپنی خوبصورتی، اپنا دس، اپنی حرارت سب کچھ تقسیم کر رہی تھی۔ آرکسٹر بجانے والوں کے حصے میں جیسے اس حسن، اس خوبصورتی، اس رسل اور اس حرارت سے کچھ بھی نہ آیا تھا۔ وہ صرف اپنا فرسٹ پورا کر رہے تھے۔ بالکل اس طرح جیسے میں آفس میں فائلیس ڈیل کرتا ہوں۔

زندگی کا یہ تضاد دیدنی تھا۔

جا کی سفید اسکرٹ پہنی ہوئی ایک حسینہ کے ساتھ ناچ رہا تھا جو نینسی جیسے کم خوبصورت نہیں تھی۔

جس تان سر اور کئے پر ہم تھرک رہے تھے، لپٹ رہے تھے، چوم رہے تھے۔

جن لہروں پر ہم رقصاں تھے۔

ان لہروں کے سونے کسی ایسی کیفیت سے پھوٹ رہے تھے جیسے دلی کہا جاسکتا ہے۔ جسے ادا سہی کہا جاسکتا ہے۔ جسے محرومی کہا جاسکتا ہے۔

لیکن رقص زندگی سے بہت قریب تھا۔ اتنا قریب کہ اس میں اور زندگی نہیں
کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔

زندگی کا یہ تعداد میں پھر کہوں گا کاش آپ دیکھ پاتے۔
اور اب جب کہ میں ٹینسی ٹینی پکار رہا تھا۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس مرد
ہو چکا تھا۔ وہی وقفہ جس میں ٹینسی نے مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔
لیکن وہ مجھ سے ملی نہیں۔

وہ برسین سے باہر نہیں جاسکتے تھے۔ ویسے وہ چاہتے تو دنیا جہاں
کو رو نہ کر رکھ دیتے۔ اس لیے کہ ان کے سینے میں جو دل و دماغ رہتے
تھے ان کی آواز مجھے معلوم تھا ایک ہو گئی تھی۔ بالکل ایک۔ لیکن اس
وقت کہیں جانے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

اب جو رقص شروع ہوتے والا تھا وہ بطور خاص ستر سال کو خوشی مدد
کہنے کے لیے تھا۔ رات کے بارہ بجکر ایک سکندر پر ستر سال کو اپنے کن بھول
پراٹھا کرنا چھنے والے تھے۔ جانے والے سال کو دعا دعا بوسہ دینے والے
تھے لیکن جانے والا سال جیسے اس گہما گہمی سے اس رقص سے آنکھیں چپا کر
اور دامن بچا کر گھر جانا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ اس کے ہونٹوں کی پاپٹل
اڑ گئی تھی۔ اس کے چہرے کا غاڑہ سفید سفید دھبے بن کر ابھر آیا تھا۔ اس کے
اعضاء کا تناؤ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے جسم کی پکار چپ ہو گئی تھی اور اب اس کا
دل کھڑ جانے والا تھا۔

یہ حساب تو بعد میں ہوتا رہے گا کہ ہم نے اس سال سے کیا کیا، اور

اس سال کو کیا دیا۔ کتنے تو ایسے ہوں گے جو یہ سوچتے بھی نہ ہوں گے کہ ہمیں اس طرح بھی حساب کتاب کرنا چاہیئے۔ اور کیوں سوچیں۔ زندگی بہر حال گزراں ہے، قصاں ہے۔

مجھے کیر و زردہ کی میں اپنا پھرہ صداقت نظر آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ تل بھی نظر آ رہا تھا جو میرے بائیس کال کے اد پر ہی تھے پر تھا اور جو نینسی کو بہت پسند تھا اور جس کو اس نے کئی بار چوما تھا۔

میں بہت کچھ سوچ رہا تھا۔
لیکن کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا ہوں۔
شاید یہ سب دہکی کا کرشمہ تھا۔

ڈانس شروع ہوتے ہیں ابھی کچھ دیر بھتی۔

مجھے شدید تنہائی کا احساس ہو رہا تھا۔ حالانکہ یہاں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ میں جتنی چاہیے پی سکتا تھا۔ جس عورت سے چاہے شریفانہ بات چیت کر سکتا تھا۔ اس کو پیسنے کا آذر کر سکتا تھا۔ پھر کتنی ہی ایسی بھتیں جن کے ہونٹوں کی سرخی، میں دہکی کے صرف ایک گھونٹ کے بدلے میں چراغے سکتا تھا۔ لیکن یہ تنہائی مجھ پر کیوں مسلط ہو رہی تھی؟

وہ کون سی شے تھی جو چپکے چپکے سے آگے بڑھ کر میرے دل کے بازار میں سے ہوتے سامان کا سودا کر رہی تھی۔ اور سب بچھ اس بے دردی سے اٹھا رہی تھی جیسے یہ بازار اب بھائیں بھائیں کرنے لگے گا۔

مجھے نینسی نے اس کو دیا تھا۔ میں اس حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کرتا

وہ شے نینسی ہی تھی جو میرے دل کے بازار میں بیچے ہوئے سامان کا سودا کر رہی تھی۔
مجھے ادا اس ہونا نہیں چاہیے تھا۔ ویسے میں نینسی کے ساتھ بھی تو نہیں آیا
تھا۔ اس کی ماں نے تو مجھ سے کہا تھا کہ وہ نیوا یز بھی میں منارہی ہے۔

میں نے جھٹ سفید اسکرٹ پہنی ہوئی حسینہ کا ہاتھ تھام لیا جو میرے
برابر سے گزر رہی تھی جس کو میں حیا کی کے ساتھ ناچتا ہوا دیکھ چکا تھا اور جو
نینسی سے کم خوبصورت نہیں تھی۔

اس کے پیچھے سفید سوٹ پر کالی بونگایا ہوا ایک نوجوان بھی تھا جو شاید
اس سے پیگ بڑھانے کی فکر میں تھا۔

”اد“۔ اس نے ”اد“ اس انداز سے کہا جیسے میرے ہاتھ تھام لینے
پر خوشی سے چیخ اٹھی ہو۔

میں نے بڑی بے تکلفی سے اس کو اپنے پاس بٹھالیا۔ اس نے بھی اپنی کرسی
قریب کر لی۔

پہلے یہ بتاؤ کیا بیوگی؟

نوجوان مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے میں کسی ایسی سگریٹ کا دھواں
ہوں جو مسلسل اس کی آنکھوں میں گھس رہا ہے۔

”تم کیا پانی رہتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔
”کیر و ز دہسکی“

”تو پھر کیر و ز جن پیوں گی؟“

میں نے ہیرا کو آواز دی

مجھے نینسی کا خیال آیا۔

میں نے بہت احتیاط سے سفید اسکرٹ پہنی ہوئی حسینہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی نرمی سے چوم لیا۔

مجھے نینسی کا پھر خیال آیا۔ جیسے وہ میرے تل کو چوم رہی ہو۔
میں نے اپنے گلاس کو ایک ہی گلاب میں خالی کر دیا۔
میں نے پھر میرے کو آواز دی۔

جب وہ سب کچھ رکھ گیا تو ہم نے جام ٹکرائے اور سب کیا پھر میں نے کانٹے سے اٹھا کر گھلی کا قتلہ اپنے ہاتھ سے اپنے ساتھی کو کھلایا۔

ہاں میں یہ کہنا ہی بھول گیا کہ جب جام ٹکرائے گئے تو ہم نے (HAPPY NEW YEAR) کے نام منسوب کیا۔ جیسے ہم دونوں پریسز ڈانس روم کے ساتھی نہ ہوں بلکہ گلاس قیلوز ہوں جو ایک ہی سبق رٹ کر آئے ہوں۔ ورنہ ہر نیا سال اپنے جھلو میں صرف خوشیاں ہی لے کر تو نہیں آتا ہے۔ میں نے سوچا ہم نئے سال کے نئے غموں کے نام لکھی تو جام تجویز کر سکتے تھے۔

رنگوں کی بہتات ہی رنگوں کا حسین امتزاج بن گئی تھی۔ وہ ٹیبل جن پر ہم بیٹھے ہوئے تھے بار کے پورشن سے متصل ایک گوشے میں تھا۔ سارا ڈانس روم اور اس کے اطراف کا کھلا ہوا حصہ جس میں بے شمار میزیں اور کرسیاں تھیں اور جن پر بے شمار دل دھڑک رہے تھے، دور دور تک ہماری نظروں کی پہنچ میں تھا۔

یہاں بھی صرف قہقہے نہیں تھے۔

کچھ ٹھٹکی ٹھٹکی نظریں بھی مجھ سے ملیں۔
 کچھ دبی دبی سسکیاں بھی میرے ہاتھ لگیں۔
 کچھ ڈھکے ڈھکے آنسو بھی میرے دامن دل کو بھگو گئے۔
 کچھ چھپی چھپی آنکھیں بھی میرے سینے میں در آئیں۔

ہمارے میز کے مقابل کچھ ہی فاصلے پر ہماری سامنے ایک عورت
 کچھ اس اداسے آنسو کریم کھا رہی تھی جیسے آنسو کریم بہت گرم ہو، اور اس کو
 گلنڈا کرنے کے لیے تھوڑا سا دقت اسے چاہیے۔

اس عورت کی عمر۔۔۔ لیکن میں عمر کس طرح بتا سکتا ہوں۔ اس لیے کہ عورت
 کی کوئی عمر ہی نہیں ہوتی۔ یوں سمجھئے کہ بچپن کی اس منزل پر تھی جیسے درخت پر
 لگا ہوا ایک ایسا پھل ہو جو ہوا کے ایک ہلکے سے جھونکے سے اپنی شاخ سے
 الگ ہو سکتا ہو۔۔۔ اس کی جوانی اور آنے والی عمر جسے میں بڑھایا نہیں کہہ
 سکتا کچھ سہمے سہمے بڑی احتیاط سے آپس میں گلے ملتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔
 لیکن وہ کسی زمانے میں بہت سوں سے بڑھ چڑھ کر رہی ہو گئی کیوں کہ وہ اب بھی
 بہت سوں سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں بلا کا حزن تھا۔ ایسا
 حزن جو ٹھہر کر غم کر لیں انتظار ہی انتظار بن گیا ہو۔

میرے اسے بار بار بڑی خور سے دیکھا تھا۔ اس دقت بھی جب وہ
 تاج رہی تھی اس کی آنکھیں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

اب جب کہ وہ آنسو کریم کھا رہی تھی اس وقت بھی وہ کسی کو ڈھونڈ رہی
 تھی۔ ویسے اپنی میز پر وہ تنہا نہ تھی۔ ایک اور عورت اس کے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔

ایک مرد اس کے مقابل تھا۔ جو اس کو طرح طرح سے بھڑا رہا تھا۔

سیری ساکتی نے مجھ سے پوچھا۔

”کس کے انتظار میں ہو؟“

میں نے نفی میں اس طرح جواب دیا جیسے مجھے منتہی کا انتظار نہیں ہو۔

”ڈارلنگ۔“ میں نے اس سے معافی چاہی اور اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس کا نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا لیکن اسے چوم نہیں سکا لاکھ

وہ سو بار چومنے کی شے تھی۔

”تام کیا ہے تمہارا؟“

”پولن“

”کیا کرتی ہو؟“

”اسٹوڈنٹسٹ ہوں“

”کہاں۔۔۔ کسی گورنمنٹ آفس میں؟“

”ہاں۔۔“

”پھر اپنے ساتھیوں سے اپنا اتنا بہت سارا حسن کس طرح بچا لیتی ہو؟“

”ساتھیوں سے اپنا حسن میں نہیں بچاتی۔ اس دفتر کا سب سے بڑا عہدیدار

یہ فرض پورا کرتا ہے“

”کس طرح بھلا؟“

”میں اس کی پیشی کی اسٹوڈنٹ ہوں۔“ وہ کچھ رک کر پھر کہنے لگی۔

”دفتر کے سارے ساتھی مجھے صحن حسرت سے دیکھ لیتے پر ہی اکتفا کرتے

ہیں۔ مجھ سے بات کرنے کی بھی ان میں ہمت نہیں ہوتی۔“
 ”اور اگر کوئی مجھ جیسا بے گلا بات کرے تو“
 ”تو میں اسے“ لفٹ“ نہیں دیتی۔

”ایک آدھ ایسا بھی ہو گا جو تمہیں لفٹ نہیں دیتا ہو گا لیکن تمہاری
 نظریں اس تک نہیں پہنچتی ہوں گی۔“

”ہو گا کوئی۔۔۔ یا اگر میرے آفس میں تم ہوتے تو شاید تمہیں ہوتے۔“
 ”میں اس طنز کو سمجھ رہا تھا۔“

”یہاں اب مجھے کھل کر مسکرانے کی ضرورت تھی بلکہ اسے چومنے کی بھی۔“
 لیکن میں صرف مسکرا سکا۔۔۔ جو م نہ سکا۔

”میں ہوتا تو تمہارے پاس کے سامنے بیٹھ کر بے اندازہ محبت کی باتیں
 کرتا۔“ میں اس سے آدم کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ایک دم اکٹھ کھڑا ہوا جیسے
 بجلی کا کرنٹ چھو گیا ہو
 شاید منشی واپس آگئی تھی۔

— میں نے بہت تلاش کیا۔ میری نظریں گوشے گوشے میں کھٹکتی رہیں۔
 — لیکن وہ منشی نہیں تھی جس کو میں منشی سمجھ بیٹھا تھا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“

”ایک دوست کو۔“

”گرل فرینڈ ہو گی کوئی؟“

”اگر میں ہاں کہہ دوں تو تم جل جاؤ گی۔“

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ کہنے لگی۔

”یہاں عورتیں عورتوں کی دوست بن جاتی ہیں اور مرد مرد کے قریب“

”کافی سمجھ دارہ ہوں۔ مجھے بچہ ملنا پڑے گا تم سے۔۔۔ بلو گی؟“

”ہاں۔“ اس نے وعدہ کی قطعیت کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

اور جب وعدہ ہو چکا تو آدھ کسٹرا شروع ہو چکا تھا۔

اس نے مجھے کھیجا۔

میں اب ڈانس کرنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔ لیکن کوئی چارہ نہ تھا۔

اس کے باوجود میں نے اس کی کمر میں اپنی گرفت کو مضبوط رکھا تاکہ اس کو میری
س بے دلی کا احساس نہ ہو۔

کوئی منٹ بھر بھی نہ گزرا ہو گا کہ کس نے مجھے ٹیگ کیا۔

اور میں فوراً ڈانس روم سے باہر نکل آیا۔ اور دوسری میز پر جا بیٹھا
تاکہ پولس کے لیے مجھے دیکھ سکے گا امکان کم ہو جائے۔

آہستہ آہستہ رقص میں رنگ آ رہا تھا۔ گرمی آرہی تھی، زندگی آرہی تھی۔

پھت کے قریب رنگ برنگے سیلون میں کوجوم رہے تھے اور اس طرح
رنگوں کا ایک رقص ڈانس روم کے فرش سے بلند میز پر ہو رہا تھا جو افسانہ کی پہچ
سے باہر تھا۔ جو دوستی اور رقابت کے جذبات سے ملتا تھا۔

عرش تا فرش رنگوں کا یہ سیلاب موج در موج اٹھ رہا تھا۔

نیا سال اب آنے کو ہی تھا۔

آدھ کسٹرا نئے سال کی سواگت کے لیے اپنی لے کو تیز تر کر رہا تھا۔

ڈانس روم کے فرش پر تیز تیز ہنسنے والے قدموں کی پراہنگ کھٹکھٹ
آرکسٹرا کی نئے سے نئے ملا رہی تھی۔

ادریس نے سال کے قدموں کی آہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔
پولن ایک چینی لڑکے کے ساتھ ناچ رہی تھی۔

ہری ساری والی وہ عورت بڑی گرم جوشی سے کسی کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی
اور اس کی آنکھوں میں اب وہ جوان دور دور تک نہیں کھتا جو میں کچھ ہی دیر پہلے
اس کی آنکھوں میں دیکھ چکا تھا۔

شاید وہ شخص اٹھ مل گیا تھا جس کی وہ منتظر تھی۔
ایک چھری سی لڑکی ایک چھری سے لڑکے کے ساتھ سب سے زیادہ گرجو
دکھا رہی تھی۔ دونوں ہی معمولی شکل و صورت کے تھے لیکن اس بھرے پورے
ڈانس روم میں وہ سب سے زیادہ مطمئن دکھائی دیتے تھے۔
ایک کھنڈر جو ان ایک مسلم لڑکی کو بڑے چارے اپنے بازوؤں میں سمیٹے ہوئے
ناچ رہا تھا۔

یہاں صرف عورت تھی، مرد تھا، یہاں صرف پیار تھا، جذبہ تھا، یہاں رقا
بھی تھی لیکن یہاں مذہب کہیں نہیں تھا۔

پتہ نہیں ان میں سے کتنے اپنے بازو ایک دوسرے کی کمر میں ڈالے۔ اپنے
ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں دیے کسی اور ہی کے متعلق سوچ رہے ہوں جوش
اس ڈانس روم میں ہو ہی نہیں سکتا اگر ہو بھی تو کسی اور ہی کے ساتھ۔ ایک دوسرے
سے اتنا قریب ہو کر بھی ایک دوسرے سے بہت دور۔ یہاں قرب و دوری کا

نئے سال کی آمد کا منتظر تھا۔

— اور میرا دواں دواں ننیشی ننیشی پکار رہا تھا۔

میرے گلاس میں دھکی کا صرف ایک گھونٹ باقی رہ گیا تھا۔

اور میں اپنے چہرے کا تل اس دھکی میں دیکھ سکتا تھا۔

اور اس تل پر ننیشی کے بوسوں کی حدت کو اب تک محسوس کر سکتا تھا۔

ننیشی یہاں نہیں تھی۔ وہ نئے سال کا انتظار کیے بغیر۔ جا کی کے ساتھ
بھی تھی۔

میں جب پرسینر میں داخل ہوا تھا تو زندگی میں کتنا حسن داخل ہوا تھا
تکس قدر خوبصورت تھا، لمبے کیسا سبز دھج کر میرے آگے سے گزرا ہے

— اور اب دیکھتے ہی دیکھتے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ یہاں تو وہی سب کچھ
لیکن ننیشی نے شاید زندگی کو دیکھنے کے سارے زاویے بدل کر رکھ دیے

— باہر کا جگمگاتا ہوا ماحول میرے سینے میں چھپی ہوئی ادا سیوں میں بنا ہوا
رہا تھا۔ خوار حیت غیر محسوس طور پر میری داخلیت میں جذب ہو رہی

— ہری ساری دالی عورت نے جیسے اپنی آنکھوں کا سارا حزن مجھے سونپ
یا تھا۔

ننیشی یوں بہت دنوں سے مجھ سے نہیں مل رہی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ جا کی ان دونوں اپنا سارا پیار اس پر سمجھا دے کر رہا تھا
میں یہ بھی جانتا تھا کہ نینسی اس پیار کو بڑی بہت سے سمیٹ رہی تھی۔
لیکن میں کبھی اس سے مل لیتا تو وہ مجھے نظر انداز نہ کرتی۔

اس کے باوجود اب میرے لیے نینسی میں کیا تھا۔

ویسے اس کی شخصیت میرے لیے نقص کا ہوں، سینما گھر و ف، رستورانوں،
ادریار کوں ہی میں قابلِ توجہ رہی تھی۔

جیب سبک ہوتی تو مجھے کبھی نینسی کا خیال ہی نہ آتا۔

جیب کا بوجھ مجھے اکسانا تو اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے نینسی کی مدد کی
مجھے ضرورت پڑتی۔

لیکن آج نینسی مجھے حاصل نہ تھی۔ تو

لیکن آج نینسی مجھ سے چھپی جا رہی تھی۔ تو

میری نہ صرف دلچسپی اس میں بڑھ رہی تھی بلکہ کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے
نینسی میرے لیے ادھر بھی چھلکتی۔

چھیپے۔

نینسی میری اداسی بن سکتی ہے۔

نینسی میری محرومی بن سکتی ہے۔

نینسی میرا غم بن سکتی ہے۔

۔۔۔ اور میں اٹھ اٹھ کر نقص گاہ میں داخل ہو گیا تھا تاکہ وس سچائی کو

لا دوں اگر یہ سچائی ہے۔

ایک لڑکی پر نظر میں جم کر رہ گئیں جو شلوار اور کرتا پہنے ہوئے تھیں۔ کہتے
 پر بڑے بڑے پھول تھے پھولوں کا رنگ لال تھا۔ وہ گلاب سے زیادہ خوبصورت
 تھے اور ان میں دنیا کے پھولوں سے زیادہ خوشبو تھی یا پھر میں کچھ اسی طرح
 محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ خاصی اچھی تھیں۔ اس کا سارا حسن اس کے بدن میں سمٹ کر رہ گیا تھا
 بدن جو بولتا تھا۔ بدن جو سازشیں کرتا تھا اور میں اس بدن سے قریب ہو گیا
 تاکہ نینسی کے خلاف سازش کر سکوں۔ اسے جھٹلا سکوں۔

جب تک وہ میرے ساتھ رہی میں بڑی گرم جوشی سے اسکے ساتھ ناچا رہا۔
 جب وہ مجھ سے جدا ہو گئی تو میں نے سوچا کہ آنکھ بند کر کے جو کئی پاس سے
 گزرے اسے ٹیگ کر دینا چاہیے۔ یہ بھی ایک دلچسپی کا شغل تھی۔
 سو میں نے کیا۔ ایک سرد اور جی دو قدم پیچھے ہٹ آئے۔

میں نے آگے بڑھ کر عورت کی کمر میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔ لیکن مجھے اس کی کمر
 کہیں نہیں ملی۔ ایک آناج کی بوری تھی جسے میں سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا
 میں بڑھلا سا گیا۔ وہ بانپ رہی تھی۔ مجھے اپنے دماغ کو اس کی سانسوں سے
 بچانے میں بڑی مردانگی بتانی پڑی۔ ہم ناچ کیا کر رہے تھے۔ بس بھرے ڈانس
 روم میں جھوم رہے تھے بلکہ یوں کہیے ہاتھی کی طرح جھول رہے تھے۔ اس
 ہاتھی کی طرح جس کا ہمدان اس کی سونڈ سے لگا کر لے چکا رہا ہو۔ میری
 کسمپرسی دیدنی تھی۔ میں نے بڑی حسرت سے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی مرد مجاہد نہ
 تھا جو میری طرف بڑھے اور اس ”فرہ اندام“ حسینہ کو میری بانہوں سے جدا کرے۔

سردار جی بجائے کسی اور کے ساتھ ناچنے کے قریب ہی ایک کونے میں کھڑے
 ہمیں تاک رہے تھے۔ میری نظر ان پر پڑی تو میں نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا۔
 وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھے اور میں نے شکریے کے ساتھ ان کی بوری جوں کی
 توں ان کے حوالے کر دی۔ اور جب تک میں اس بوری کے ساتھ رہا ہوں اس
 پورے وقت میں نینسی مجھے یاد ہی نہیں آئی۔ لیکن نینسی کی یاد سے بچنے کے
 لیے میں بار بار خودکشی کیسے کر سکتا تھا۔

اس حادثے نے میرا دل سہا سکون بھی چھین لیا۔

جی جیسے ہر چیز سے ادب گیا ہو۔

گلابی رنگ کا اسکرٹ پہنی ہوئی ایک حسینہ جو انگلش اور انڈین منسل کی
 آئینہ نش معلوم ہوتی تھی ایک بہت ہی بانگے اور سچیلے نوجوان کے ساتھ ناچ رہی
 تھی۔ وہ کچھ اس قدر انہماک سے ناچ رہے تھے کہ انھیں منٹ بھر کے لیے جدا
 کرنا بھی مجھے گوارا نہ تھا۔ لیکن وہ جب میرے مقابل آگئے تو میں نے آکر کسٹراکے
 اشارے کو غنیمت سمجھا۔ نوجوان نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ ظاہر ہے
 مجھے یہ بھی تو گوارا نہ تھا کہ تہذیب سے گری ہوئی اس کی اس حرکت کو سہہ لیتا۔
 میں نے ذرا فورس سے پھر ٹیگ کیا۔

نوجوان ہٹ آیا۔

مسڈ بلڈ حسینہ میری بانوں میں تھی۔ اس کے کپڑوں سے بھینی بھینی سی
 خوشبو پھوٹ رہی تھی اور یہ خوشبو مجھے نینسی کی یاد دلانے لگی اور نینسی کی یاد
 مجھے پھر اس کر رہی تھی۔

مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے میں خود اپنے ہی ساتھ ناچ رہا ہوں۔
 حسینہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور وہ میرے ساتھ ناچتے ہوئے انہیں
 چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن میں نے اس کی پھپھکی ہوئی آنکھیں صاف
 طور پر دیکھ لی تھیں۔

جب میں اس سے جدا ہوا تو مجھے محسوس ہوا جیسے میں منی سے جدا ہو رہا
 ہوں۔ جیسے خود اپنے آپ سے جدا ہو رہا ہوں۔

میں اس طرح ڈانس ہال سے چلا آیا جیسے میں خود نہیں چل رہا ہوں کوئی مجھے
 کھینچے لیے جا رہا ہے۔

میری نظر جہانگیر پر پڑی جو کبھی میرا کلاس فیلو تھا۔ اس نے مجھے دس کیا
 وہ اس حسینہ کے ساتھ ناچ رہا تھا جس کا بدن بولتا ہے۔ جس کا بدن سارن
 کرتا ہے۔

وہ حسینہ جس کے جسم سے کھینچی جینی خوشبو پھوٹتی ہے اور جو اپنی آنکھوں
 میں بڑی احتیاط سے آنسو چھپائے رکھتی ہے پھر اسی بلکے اور سچیلے نوجوان کے ساتھ
 ناچ رہی تھی جو خود بھی شاید اس کے آنسوؤں کی حفاظت کرتا ہے۔

سردار جی کو غالباً میں نے دہشتہ بھلا دیا جو اپنی غلے کی بوری سمیٹے ہوئے
 کہیں ہوں گے۔

یوں البتہ ایک بڑے عجیبہ کھ نوجوان کے ساتھ ناچ رہی تھی۔
 میں نے ہان پانگے لیے میرے سے کہا اور سگریٹ جلا کر ایک میز سنبھال لی۔
 ڈانس ہال میں خوشیاں زیادہ تھیں۔ غم کہیں کہیں تھا جیسے خوشیوں کی پوش

سے پھپھکتا پھر رہا ہوتا۔

مجھے محسوس ہوا جیسے میں بھی پھپھکتا پھر رہا ہوں۔

میں نے کبھی جاکی کو رقابت کے جذبے سے نہیں دیکھا تھا۔

نہیں جب وہ دوسری دفعہ مجھ سے بار میں ملا تھا۔ جب کہ منشی

نہیں اسی کے ساتھ تھی۔ لیکن باتیں کرتے کرتے منشی نے مجھے کچھ اے

دیکھا تھا جیسے چار پانچ دن سے مجھ سے بالکل نہ ملنے پر ندامت محسوس

دیے۔ دروازہ ہم کم ہی ملتے تھے۔ لیکن شام کے وقت کہیں کہیں تو مل

جاکی اس سال کی سیزن میں دھیرہ دون سے آیا ہوا تھا

ہو جانے پر بھی اب ناکت میں تھا۔ اس سے منشی کی پہلی ملاقات میرے

ڈانس میں ہوئی تھی پھر وہ ایک دوسرے سے ملنے لگے تھے۔ اس

اس کو سیر راہ کئی بار جاکی کے ساتھ گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور

نظر آئی تھے اور بہت ہی خوبصورت کپڑوں میں ملبوس نظر آئی تھے

ہوا کہ صبح کو پہنا ہوا اسکرٹ میں نے شام کو اس کے سجیلے بدن پر نہیں

اس کا یہ بناؤ سنگا رہا جاکی کی خوشحالی کی نشاندہی کرتا تھا وہیں

کا احساس بھی دلاتا تھا۔ میں نے خود کو اس طرح قسبی دے لی کہ چلو

دوست کا مستقبل سرتوں کے گلے میں باہنیں ڈالے زندگی سے پیسا

میں نے کوشلیا کی طرف اپنی توجہ مبذول کر دی جو ایک خانگی انسٹی ٹیوٹ

میں انگریزی پڑھاتی تھی۔ جو بہت شریلی تھی۔ جو جو م لینے سے عورت

تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ جاکی منشی پر بے دریغ روپیہ صرف کر رہا تھا

میٹنگ میں اس کے ساتھ ریس کو رس جاتے لگی ہے۔ کبھی کبھی اس کی علانی
 ماں کبھی اس کے ساتھ ہوتی ہے جو قریباً اس کی ہم عمر ہے اور اس کا باپ بھی جو
 ماں اور بیٹی سے دو گنی عمر کھا چکا ہے۔ مجھے اس کا بھی پتہ چلا کہ یہ لوگ ریس
 کھیل بھی لیتے ہیں اور یہ سب جاکی ہی کی جیب کا رہین منت ہے۔

مجھے ان ساری باتوں کو سن کر کبھی کبھی جاکی سے رقابت نہ ہوتی۔ اس کی
 دجوات شاید یہ ہوں کہ۔۔۔

زندگی کی نفس گاہ میں نینسی میرے لیے ایک ایسا سا کھتی کھتی جو صرف
 ٹیک کرنے پر مجھ سے جدا ہو جاتا ہے۔

زندگی کے شراب خانے میں نینسی ایک ایسی شراب کھتی جس کا حسن ہر
 جام میں ڈھل جاتا ہے اور جس کی حرارت ہر شیشے کو کچھلا دیتی ہے۔

میں اس کے پیچھے اس طرح بھاگ رہا تھا جیسے ایک پتہ تلی کے پیچھے دقت اور
 فاصلے کا خیال کیے بغیر بھاگتا ہے۔ لیکن آج جب کہ نینسی مجھے نظر انداز کر کے
 آگے بڑھ گئی تھی تو مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں شاید اس کے تعاقب میں
 بہت دور نکل آیا ہوں۔

اور آج میں جاکی کو کچھ اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ میرے گھر آیا تو میں نے
 دروازے کے دونوں پٹ کھول کر اس کو خوش آمدید کہا، اس کی تواضع کی
 لیکن جب اس کو وداع کرنے کے لیے اٹھا تو وہ کچھلے دروازے سے جا چکا تھا
 اور مجھے اس دقت معلوم ہوا کہ میرے گھر میں کوئی کچھلا دروازہ بھی ہے۔

اور آج اسی کچھلے دروازے سے نینسی میرے ہمارے خانہ دل میں داخل

ہو رہی تھی۔

دہی نینسی جو رقص گاہ سے مجھ سے ملے بغیر جا کی کے ہمراہ کہیں چلی گئی تھی۔
دہی نینسی جس کا آج سے پہلے اس طرح میں نے کبھی انتظار نہیں کیا تھا۔
میں اپنی میز پر بیٹھا بیٹھا ڈانس ہال کے جگمگاتے ماحول سے بے نیاز جاتے
کہاں کہاں رہا۔ لیکن میں پھر رقص گاہ میں لوٹ آیا تھا۔ میرے کلاس میں
ابھی کھوڑی سی دہکی باقی تھی۔

میں نے دہکی ختم کر لی اور ڈانس ہال میں جانے کے لیے اٹھا۔
میں نے دیکھا نینسی سگریٹ کے دھوئیں کے پیچھے اپنا چہرہ پھپھائے ڈانس
ہال کے نیچے صحن میں کھڑی..... کچھ تلاش کر رہی تھی۔ جا کی اس کے ساتھ نہ تھا
اور دھوئیں کی چادر آہستہ آہستہ ہٹ رہی تھی۔ اور اس کا بھرہ نمایاں ہو رہا تھا
کہ اس کی نظریں میری نظروں سے ملیں۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا۔

کسی بے نام سی خوشی نے مجھے لمحے بھر کے لیے گدگد کر چھوڑ دیا۔ نینسی نے
مجھے نظر انداز نہیں کیا تھا۔ وہ جا کی کو کہیں چھوڑ کر میرے پاس چلی آئی
تھی، اور یہ خیالی میرے ان سارے جذباتوں کو جھٹلا رہا تھا جو اس کے غیاب
نے مجھ میں پیدا کر دیے تھے۔

لیکن میں چاہتا تھا کہ نینسی ایسی کوئی بات محسوس ہی نہ کرے۔

میں اس کی جانب اس طرح بڑھ رہا تھا جیسے اپنی ساری دلچسپیوں کا اس کی
خاطر خون کر رہا ہوں۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے میرا ہاتھ تھام

کہ مجھ سے باہر چلنے کے لیے کہا۔

اس کا گلہ نہ دھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

جب ہم پر سبز سے باہر نکل گئے تو آپس میں کچھ کہنے سے بغیر چلتے رہے۔

میں کو رس کے قریب پہنچ کر وہ میرے سینے پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔

میں نے اس کو اپنی بانہوں میں لے کر اس کے آنسو پونچھے۔ اس کی ادا

کا سبب پوچھا۔

جی چاہا اسے بتلا دوں کہ میں بھی اس کے لیے اتنا ہی ادا اس تھا۔

جی چاہا اسے بتلا دوں کہ آج جب مجھے اس کی جہانی کا احساس ہوا تو

میں ایسے ہونٹوں کو بھی نہیں چوم سکا ہوں جو میرے لیے بھول کی طرح کھل

رہے تھے۔

لیکن میں کچھ بھی تو نہ کہہ سکا۔

صرف اس کیفیت کو چھپاتا رہا جو آنسو بن کر ساری ہستی پر چھا جاتی ہے۔

منہسی کچھ بولنا چاہتی تھی۔

اور میں سب کچھ سن کر مینا چاہتا تھا۔

اس نے بہت ہی آہستہ سے کہا جیسے بہت بلندی سے بول رہی ہو

اور میں اس کی آواز کے آہستہ کے آہستہ کے نیچے کھڑا اپنی آنکھیں بھگو رہا تھا،

اپنا دل بھگو رہا تھا۔

”جا کی سسٹر کو لے کر بھاگ گیا ہے (وہ اپنی علاقائی ماں کو سسٹر پکارتی

تھی) وہ کہہ گئے ہیں کہ میں تین چار دن تک ڈیڑی کو کسی طرح دھوکے میں؟

رکھوں۔ میں ایسا کس طرح کر سکتی ہوں۔ لیکن اسے یقین ہے کہ ہر کام لے سکتا ہے۔ اس نے جاتے ہوئے مجھے صرف ایک بار گویا ہے کہ میں تم سے کہہ دوں کہ وہ تمہارے بھول کو اپنے کوٹہ سجا سکتا۔

میں نے پھر محسوس کیا کہ نینسی میرے گھر اسی پچھلے دروازے ہو رہا ہے جس دروازے سے کبھی جا کی باہر نکل گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ نینسی میرے لیے نہیں آئی اس کی مجبوراً لیے آئی ہے۔

اس کی لٹی ہوئی محبت میرے لیے آئی ہے۔
نینسی تو جا کی کے ساتھ جایا چکی تھی۔

کوئی مجھ سے سرگوشی کرنے لگا۔ تم بھی تو اس نینسی کے ہو۔ تم بھی تو اس نینسی کے ساتھ جایا چکے ہو۔ لیکن میں جواب دہی نہ دے۔
”یہ جھوٹ ہے، یہ جھوٹ ہے۔“

پیرسیر سے آرگسٹر کی مدھم مدھم لے ہواؤں کے دوش پر سوار ہو کر پہنچ رہی تھی۔ ساتھ ہی کچھ ایسی آوازیں بھی تھیں جس سے اس بات کا ہوتا تھا کہ نیا سال شروع ہو چکا ہے۔ پیرسیر میں لوگ نئے سال کو کوکھ اٹھا کر ناچ رہے ہوں گے۔ جا کی کا موٹر ہواؤں سے باتیں کر رہا ہوگا۔ سسٹر جا کی سے لگی ہوئی سوچ رہی ہوگی کہ اس کا بوڑھا شوہر خواب میں سال سے گلے مل رہا ہے۔

موٹر پر گرے ہوئے مینسی کے آنسو اب خشک ہو گئے ہوں گے اور ان پر گرجم نہ ہوگی۔

مجھے خاموش پا کر مینسی نے مجھے دیکھا۔

میں نے نظریں جھکا لیں۔ پھر میں نے کچھ رک کر امانیسی نیا سال شروع ہو چکا ہے۔

وہ بڑھی اس نے اپنا سر پھر میرے سینے پر رکھ دیا۔ میری قمیض اس کے آنسوؤں سے نم ہو چکی تھی۔

پھر یکایک وہ سنبھل کر پیچھے ہٹی۔ رک کر میرے کوٹ کے بٹن درست کیے۔ پھر خلاؤں میں کچھ دیکھا اور دو قدم بڑھ کر نئے سال کا جازہ اس نے اپنے کندھے پر بڑی احتیاط سے اٹھالیا۔

میں نے اس بوجھ کے اٹھانے میں اس کی کوئی مدد نہیں کی۔

بس کھڑا ہوا چپ چاپ دیکھتا رہا۔

یہاں تک کہ وہ ٹیکسی میں سوار ہو چکی تھی۔

میں تو سدا کا تماشائی ہوں۔

شعور سفر منزل

شعور

”قنبر علی کی گھوڑی میری“

”شیخ محبوب کا گھوڑا میرا“

”سید ابراہیم کا تازی اسپ میرا“

”اور بھیا آپ کچھ نہیں لیتے۔“

”بانو میری، بانو میری، بانو میری — بھیا بانو کو تاکتے ہوئے اس طرح

کہتے کہ وہ ان کی آواز سن لیتی اور نیچی نیچی نظروں سے انھیں دیکھتی ہوتی پرے

ہو جاتی۔

”نیا صوفہ سٹ میرا“

”ڈینگ ٹیل میرا“

اس طرح نہیں بھی پہلے ڈرائنگ روم کا سامان بانٹ لیں — کوئی معترض نہ ہوتا۔

”اچھا ابھی شیشم کی کچھ کرسیاں میری“
 ”قالین میرا“

لٹکوتالیاں بجا کر ناپچنے لگتا۔ واقعی قالین پر کسی نے توجہ نہیں کی تھی۔ ڈرائنگ روم کی سب سے بڑھیا شے تو وہی قالین تھا۔ دادا ابا جب مشرق وسطیٰ کے دورے پر گئے تھے تو ایران سے لے آئے تھے۔

”بھئی میرے لیے تم لوگوں نے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔“ پتہ نہیں مالی غنیمت تقسیم ہوتا رہتا تو بھیا کہاں سے آدھکتے۔

”ہیں نا اتنی ڈھیر دن سی چیزیں۔ پند کر لیجئے بھلا“

وہ کچھ ادھر ادھر دیکھتے۔ جیسے ساری چیزوں کو بنور دیکھ کر نظروں ہی نظروں میں پرکھ رہے ہوں۔ پھر ایک دم دبی دبی آواز میں پکارا اٹھے۔
 ”بانو میری، بانو میری، بانو میری“

ہم سب احتجاج کرتے۔ جو چیزیں ڈرائنگ روم میں موجود ہوں تقسیم ان ہی میں سے ہونی چاہیے۔

وہ مان جاتے۔ ”ہاں ابھی تقسیم ان ہی میں سے ہوگی“
 ”پھر بانو کہاں ہے؟“

”بانو کہاں نہیں ہے؟“ وہ نہیں پر زور دیتے۔

”یہاں نہیں ہے، ڈرائنگ روم میں نہیں ہے“

”ہے براہِ مہر۔“

”کہاں۔“

”یہیں۔“

”پھر نظر کیوں نہیں آتی؟“ ہم سب چیخ اٹھتے۔ جھوٹ ہے، جھوٹ ہے، جھوٹ ہے۔

وہ انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھ کر تین اشارے سے چپ کرتے۔ اس طرح چلاؤ نہیں۔ ہم بتاتے ہیں۔ بس ہو جیاد تیار دیکھتے کسمے لیے ہونگے نا۔

”ہونگے نہیں، ہونگے نہیں، ہونگے نہیں۔“

اور بانو بیچی بیچی نظروں سے بھیا کو دیکھتی ہوئی ہمیں سے پردے کے پیچھے سے براہِ مہر جاتیں۔ اس طرح جیسے ان ساری باتوں سے بے نیاز ہوں۔ گلدان میں پھول قرینے سے جھارتیں۔ یا پھر ڈسٹرے کر مر کے دس سیاہی پر جو اپنے گھوڑے کی نکام تھاٹھے کھڑا تھا اس طرح ایک دو عالمی حکم چلاؤ جیسے پھول پھل چھادر کر رہی ہوں اور دبے پاؤں دوسرے دروازے سے نکل جاتیں۔ جیسے وہ چور ہوں اور کوئی شے چرانے کے لئے آئی تھیں۔

اپنی بار پر ہم بوجھلا جاتے بھلا ہٹ میں کوئی ڈھنگ کی بات نہ کر پاتے۔

سنی یکا یک چیخ بڑتی۔ ”سند نہیں، سند نہیں۔“

”کس کی سند نہیں؟“

”بانو کی۔“

”کیوں؟“

”آدمی تقسیم ہوں تو آپ بانو کو لے سکتے ہیں“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آدمی تقسیم کیے جاسکتے ہیں“

”کب“

”ابھی، اسی وقت“

”اگر سیر ہے۔“

”وہی میری“

”بابھی ہمارا“

”بھوئی خانہ بھیا کی پھوٹی خانہ بھیا کی۔“ ہم بکا راٹھتے۔
بھیا اس طرح۔۔۔ ٹھٹھا ہے جیسے بچہ نہیں منیں گے۔۔۔ تم لوگ کون ہوتے
و پھوٹی خانہ کو میرے حوالے کرنے والے ہم تو دبی چیزیں گے جو ہم کو دل سے
بستہ ہو۔

”بیچاری بھوئی خانہ کو کون لیں گے؟“

”وے لیں گے کوئی بھوئے خانہ آکر“ ہم کھلی کھلی ہنس پڑتے۔

”اے ٹھکڑو تو بے لانا۔“

”نا بھئی بھئی کون پاؤں لمانی کھلائے گا دن میں دو دو وقت“

ادھر ہم سب بھیا سے بڑھ چھڑاٹھتے۔ ”وے دیں بھیا آپ کو کیا اچھی سی چیز؟“
کوئی اچھی بڑھی چیز دے دو گے اٹھا کر تو ایک ایک کو ایک ایک لانا
پر چڑھا دوں گا۔

”نہیں بہت عمدہ چیز دیں گے“

”ایک دم بڑھیا۔۔۔“

”ہاں ہاں بالکل۔۔۔“

”اچھا دے دو بھئی۔۔۔ دیکھیں تو کیا دیتے ہو“

”یا نو بھیا کی، یا نو بھیا کی، یا نو بھیا کی“

گھر کی ایک ایک چیز جب اس طرح تقسیم ہو جاتی تو ہر چیز کا مالک اس پر اپنا اپنا حق اس طرح جتلاتا کہ اسکی بغیر اجازت وہ چیز استعمال ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ مہنی کو اپنے صوفے پر بیٹھا ہوتا تو ٹنگو میاں سے اجازت حاصل کرنی ہوتی کہ وہ قالین پر سے چل کر صوفے تک پہنچے۔ ورنہ ٹنگو میاں صاف ٹوک دیتے۔ اور مہنی قالین سے نیچے بچ کر صوفے کے پتھے کے قریب پہنچتا تو چھوٹی مہنی کتیا کی طرح اچھل کر صوفے پر جا برا جاتی۔ اور بڑی احتیاط سے اپنے پیروں سمیٹ لیتی کہ مبادا پیر قالین سے مس نہ ہوں یا نہیں۔ ایسے میں بچا رے ٹنگو میاں کو کبھی قالین ہی پر برا جانا ہوتا اور کہیں صوفے پر بیٹھنے کی اجازت نہ ملتی۔

”مہنی۔۔۔“

”جی بھیا۔۔۔“

”یہ ٹنگو میاں بچا رے غلاموں کی طرح نیچے کیوں بٹھا دیے گئے“

ٹنگو میاں ناک بھوک پڑھاتے۔ بھلا وہ اور مہنی کے غلام کہاں سے جائیں۔

بھیا کو بھی قالین پر قدم رکھنے سے وہ روک دیتے اور جھبٹ سے قالین پر ہر

کھڑے ہو جاتے، پھر ٹپکنے لگتے۔

”بھئی ہم تو ٹنکومیاں کی طرح اپنی ہیز کو چھونے سے کسی کو بھی نہیں روکنے
 لے۔“

”پھر مہنی جو مجھے صوفے پر نہیں بیٹھنے دیتی ہے، یہ ٹنکومیاں شکایت کرتے
 ”اور جو تم قالین پر پیر بھی دھرنے نہیں دیتے۔“ مہنی جواباً کہیں لٹاڑتی۔
 ٹنکومیاں ہم بھائی دے قالین پر سے ہو کر مہنی رانی کے صوفے تک
 پہنچ جاتیں؟“

ٹنکومیاں بڑھ کر بھیا کا ہاتھ پکڑے کہیں گھسیٹے اور اس طرح وہ مہنی رانی
 صوفے تک پہنچ جاتے۔ صوفے پر بیٹھ کر وہ بغور ادھر ادھر دیکھنے لگتے۔
 پھر اطمینان سے سگریٹ جلا کر ایک لمبا سا کش لیتے اور سامنے بے شمار
 لگول دھوئیں کے حلقے بکھر جاتے۔ ٹنکواؤں میں ایک دوسرے پر سبقت
 دہانے کے لیے دھوئیں کے حلقوں میں اپنے ہاتھ اس طرح داخل کرتے جیسے وہ
 ہمارے دائروں کو محفوظ کر لیں گے۔ بھیا سگریٹ کا لطف اٹھاتے جاتے
 رکن انکھیلوں سے دروازوں میں کچھ تلاش کرتے رہتے۔

ہم سمجھ جاتے۔ بھیا بھی کون سے ایسے بڑے بزرگ تھے۔ امی نے کل ہی
 بات ہے کہ سگریٹ فوشی پر ان کے کان اٹھتے تھے۔ فیس ذرا شہر
 باکر پتہ نہیں کون سے کالج میں پڑھنے لگے تھے وہ۔ ابھی تو ان کے ڈاڑھی
 ہی نہ آبا کی طرح بڑی بڑی موٹھیں۔ دھان پان سے بھرنی مونی سے لگتے
 تھے ہمیں۔ امی سے پن بچھوٹا تو لگے کونے میں بے جا کر ہماری منیتیں کرنے۔
 ”بانو سے نہ کہنا کہ امی نے ہمارے کان اٹھتے ہیں۔“

ہم لوگ بہتہ نہیں یہ بات بانوسے کہہ دیتے یا نہ بھی کہتے — لیکن کھیا
جب اس طرح منتیں کرنے لگے تو ہمیں بات کی اہمیت کا احساس ہوا۔
”پھر نکالے پچا کلیٹ“ مہنی چلائی۔

”دور نہ میں بانوسے“ ٹٹکومیاں نے دھونس جمائی۔

”اچھا ابھی“ انھوں نے بازوؤں سے پکڑ کر ایک ایک کو اٹھا لیا، اور
الما ری پر چڑھنا کر چل دیے۔

ٹٹکومیاں بے چارے کیسے سہمے ہوئے تھے۔ کاٹو تو او نہیں بدن میں۔
مہنی شروع شروع تو کچھ لطف اٹھاتی رہی۔ جانے الما ری کا یہ سٹ
کس طرح کھل گیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اڑا اڑھم دیکھتے دیکھتے زمین پر
آدھے گئی۔ ایک دم مہنی کے چہرے پر ہوا میاں اڑنے لگیں۔ ٹٹکومیاں پر
رفت طامی ہو گئی اور جب بھیا الما ری کے برابر سے نکل آئے تو ٹٹکومیاں
کی آنکھیں جھرنے کی طرح بھر جھربہ رہی تھیں۔

یہ الما ری پر بھڑا دینے کی سزائیں آج یاد آتی ہیں تو جی چاہتا ہوں کہ
کوئی وہ عمریں بل جھر کے لیے لوٹا دے۔

آج پھر ہم سب کے لیے رات جگا تھا۔ اب صبح ہوتے ہوتے دورے کے
لیے نکلنے والے تھے۔ امی اور ہم سب کے سب ساتھ تھے۔ دل میں پھیپھڑیاں
سی پھٹ رہی تھیں۔ کہتے ہی بارہم بستر دل پر بھجوا دے گئے۔ لیکن نیت تھی کہ
آنکھوں سے سوجھوٹہ ہی نہ کر پانی تھی۔ رخصائیوں سے چہرے نکالے ہم سارے گھر کا
جاکرہ لیتے۔ بانو آیا انتظام میں مصروف تھیں۔ ادھر کچھ دنوں سے ہم بانو کو

ذرا پکارنے لگے تھے۔ بھیا نے کہہ رکھا تھا کہ اگر انھیں بانو آ پانہ پکارا جائیگا وہ سب کے حقوق تلف کرتے پھریں گے کسی کی بات نہیں مانیں گے۔ ٹنگو میاں، قاتلین کو ان کی اجازت کے بغیر جوتوں سے رو نہیں گئے۔ منی کے دفے پر اپنے فونٹن پن کی روشنائی انڈیل دیں گے۔ پھر یہ بھی تائیں تھیں کہ اگر پوچھیں تو انھیں بتلایا نہ جائے کہ بھیا نے یہ سب کچھ سکھایا ہے۔

ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ بانو آ پانہ ادھر کچھ دنوں سے ہمیں کچھ وہ بھی اچھی لگنے لگی تھیں۔ بھیا کے سوٹ کس سے چاکلیٹ نکال کر ہمیں بیان سے دے دیتیں جیسے وہ بھی اس سوٹ کس کی مالکین ہوں۔

ٹنگو میاں کہتے جلدی کچھ بانو آ پانہ بھیا دیکھ لیں گے کہیں۔ وہ مسکراتیں۔ کیوں کیا مجھے تھارے بھیا کا ڈر ہے۔

ٹنگو میاں کچھ حیران حیران سے رہ جاتے۔ کوچی دن دھاڑے سوٹ کیا بولی کر چاکلیٹ نکال رہی ہیں۔ پھر نہ ڈر نہ خوف۔

لیکن آہستہ آہستہ ٹنگو میاں سمجھ گئے کہ بانو آ پانہ چاکلیٹ تو کیا سارے کا اور سوٹ کس اٹھا کر جس کسی کو چاہے دے سکتی ہیں۔ یہ حق انھیں کس نے ابھتا۔ وہ نہ منی کی سمجھ میں آیا، نہ ٹنگو میاں کی۔

رضائی کو پرے پھینکتے ہوئے ٹنگو میاں نے بانو آ پانہ کو تاکا جو دالان میں ٹری ناشتے کی چیزیں لٹکیوں اور ٹفن باسکٹس میں رکھ رہی تھیں۔

شیٹ۔ شیٹ۔ اور بانو آ پانہ نے گھوم کر دیکھا۔

ٹنگو میاں نے اشارہ دل ہی اشارہ دل میں انھیں ہوا کہ کیا کر رضائی بھینکے

بستر سے کود پڑیں۔

منی بھی رضائی سے منہ نکالے مٹ مٹ ساری باتوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ بانو آپا کی اجازت مل جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ ابا، امی اور خالہ بی سب کی سب سوچیں ہیں۔

”ٹنکو میاں آگے آگے تھتے پیچھے منی رانی۔“

”ہاٹ نکس میرے۔“

”ٹنکو باسکٹس میرے۔“ ٹنکو میاں چلائے۔

”اے میرے تیرے کے بچے۔ بھاگ جا یہاں سے شور مچایا تو۔“
 لوجی بھیا کو اڑکی اوٹ میں کھڑے تو لیہ ہاتھ میں لیے پلیٹیں خشک کر کے بانو آپا کو دیتے جا رہے تھے جھنیں وہ بڑے سلیقے سے باسکٹس میں رکھ رہی تھیں۔
 بانو آپا نے ایک قاب میں سے بادام کے لوزہ کا ٹکڑا نکال کر ٹنکو میاں کے منہ میں ٹھونس دیا تو وہ لگے تالیاں بجایا کر ناچنے۔

منی نے منہ کھکھایا تو بانو آپا نے اس کی تواضع کی۔

”چلو اب تم لوگ بیلری سے جا کر اپنے اپنے گرم کوٹ پہن آؤ۔ سردی نہیں لگ رہی ہے تمہیں؟“ بانو آپا نے بڑے پیار سے حکم دیا۔

ہم جانے لگے تو انھوں نے کہا۔ ”بس چپکے سے پہن آنا۔ کھٹ پھٹ کی تو تھمارے بھیا۔ اور وہ چپ ہو گئیں۔“

الما دہی کھولی گرم نے اپنے گرم کوٹ اس طرح نکالے جیسے چوری کر رہے ہوں۔
 بیل گاڑیاں غالباً احاطہ میں لا کر کھولی دی گئی تھیں۔ رات کے سناٹے میں

ان کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز ہمیں صبح کو شروع ہونے والے سفر کے لیے ابھی سے اکسا رہی تھی۔

مسنی نے گرم کوٹ کے بٹن لگاتے ہوئے شہ دی۔

”میں جاکر ابھی سی بیل گاڑی چن لیتی ہوں“

اور ٹنکو میاں سر پٹ بھاگے۔

”لال پہیوں والی بیل گاڑی میری“ مسنی نے اعلان کیا۔

اور ٹنکو میاں دل موس کہہ گئے۔ دوسری بیل گاڑیوں کے پیچھے لال تھے

ہی نہیں۔

بیل گاڑیاں تقسیم ہو گئیں۔

بیل تقسیم ہو گئے۔

انگھٹے ہوئے گاڑی بان تک تقسیم کر لیے گئے۔

مسنی بھیا کو خوش خبری سنانے کے لیے بھاگی کہ لال پہیوں کی سب سے اچھی

بیل گاڑی اس نے چن لی ہے۔ اور بھیا کی غفلت کے باعث ایک فالتو گاڑی

ان کے لیے بچ رہی ہے۔

ٹنکو میاں نے بھی بڑی عمدہ سی بیلوں کی جوڑی ہتھیلی لی تھی۔ وہ بھلا یہ خوش خبری

کس طرح نہ سناتے۔

بھیا کے پاس ہم پہنچے ہیں تو اپنا ایک گرم کوٹ وہ بانو آپا کو پہنا کر اس کا

کالر ٹھیک کر رہے تھے اس طرح کہ بانو آپا کا گلہ اور کان بھی سردی سے محفوظ

ہو جائیں۔ خود انھوں نے بھی ایک کوٹ پہن رکھا تھا۔

مٹی ٹکڑے ٹکڑے بانو آیا کو دیکھ رہی تھی۔ وہ واقعی اچھی لگ رہی تھیں۔
 ٹٹو کہنے لگا۔ اب کی بار آدمیوں کی تقسیم ہو تو میں بانو آیا کو لے لوں گا۔
 بھیانے مسکرا کر بانو آیا کو کچھ اس طرح دیکھا جیسے اپنی ساری ہستی ان پر
 لٹا رہے ہوں۔

”بانو“ یہ ابا کی آواز تھی۔

ہم سب کے سب پاؤں دبا کر بھاگے اور اپنی اپنی رضائیوں میں جا دکے۔
 بانو آیا بہت پھرتی سے بھیا کا گرم کوٹ اتار رہی تھیں اور بھیا کچھ اس
 طرح بانو آیا کو تک رہے تھے جیسے اپنی نظروں کے تانے بانے میں بانو آیا کو ہکڑ
 کر ان کو سردی سے بچا رہے ہوں۔

”بانو“ ابانے پھر پکارا۔

بانو آیا۔ ابا کی خواب گاہ کی طرف لپکیں تو دروازے تک پہنچے تو پوچھنے
 اٹھوں نے دو تین بار بھر چھری سی لی اور ان کا نازک سا جسم ایک بار تو اس طرح
 کپکپایا جیسے نیچ صحن میں پیوندی آم کے درخت کی وہ ٹہنی جو آموں سے لدی
 ہوئی ہلک ہلک کر چنبیلی کی ہیل کو گرما کی شاموں میں چوم چوم لیتی تھی۔

بھیا کے ہاتھوں میں بانو آیا کا اتارا ہوا کوٹ اس طرح جھول رہا تھا جیسے
 بھیا، بھیانہ ہوں بلکہ برآمدے میں دھرا ہوا لکڑی کا وہ اسٹینڈر ہوں جن پر
 کوٹ ٹانگے جاتے ہیں۔

جی ہاں ساری چیزیں تیار ہو چکیں۔

جی ہاں میں نے سب کچھ رکھ دیا ہے۔

جی ہاں —

ہم نے بہت کوشش کی پھر بھی اتنا ہی سن سکے۔ اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اب اچھلنے کی تیاری ہی کے بارے میں سوالات کر رہے ہیں۔

بانو آیا باہر نکلیں تو بھیا نے بڑھ کر کوٹ انہیں پھر پہنا دیا۔ وہ اسی طرح شانِ استننا سے کوٹ پہن کر آگے بڑھ گئیں جیسے یہ ان کا روزانہ کا معمول ہو۔ جیسے بھیا ان کے ادنیٰ ملازم ہوں جو صرف اسی کام کے لیے رکھے گئے ہوں۔

ہمارے دروازے کے قریب پہنچیں تو ہم دم سادھے انہیں تک لے گئے۔ کسی نے سر سے پیر تک رخصتی تان رکھی تھی انہوں نے ہلکی سی تالی بجائی۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ سنگٹل ہمارے لیے ہے۔ ہم نے دیکھا تو وہ ہاتھ ہاتھ کر ہمیں اس طرح بلارہی تھیں جیسے غلام احمد اور لکی پکڑ دانتے کے لیے فیڈلہ اورنگ کر رہے ہوں۔ ہم بھاگے بھاگے بانو آپا تک پہنچے تو انہوں نے بڑے ٹھکانہ انداز سے کہا — لائین میں کھڑے ہو جاؤ۔

ہم سب لائین میں کھڑے ہو گئے تو بھیا بھی آکر ہم میں مل گئے۔ بانو آیا مسکرائیں، کہنے لگیں، کہ آدھے گھنٹے کے اندر راندر کپڑے پہن کر ہم لوگ تیار ہو جائیں۔

بھیا تعظیماً جھکے۔ دوسرے ہو کر اس بات کا اندازہ کر کے کہ وہ بانو آپا کے احکام کی بے سرحد چشم نقیل کریں گے۔

— بھیا کو دیکھ کر ٹنگو میاں بھی جھک پڑے۔

ٹنگو میاں کو دیکھ کر ہم سب جھک پڑے۔ لیکن بانو ٹنگو میاں نے مار دی

تھی۔ بانو آپا نے انھیں بازوؤں سے پکڑ کر اٹھا لیا اور چپٹ چپٹ دو چھوٹے چھوٹے
سے پیار ان کی پیشانی پر جڑ دیے۔

کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بانو آپا اب وہ بانو نہیں رہی تھیں جو کچھ دن
پہلے تک سہمی سہمی بجائی بجائی سی ہمارے اور بھیا کے آگے سے گزر جاتیں۔ ان
میں کوئی ایسی بات پیدا ہو گئی تھی جو بانو آپا کے شایانِ شان تھی اور ہمیں ان کا
یہ نیا روپ بہت بھانا تھا۔

سفر

چاندنی سادی زمین پر پھیل بھیل کر اس طرح لیٹ گئی تھی کہ اب کبھی سورج
طلوع ہو گا نہ اسے شرماء اور لجا کر، سکرٹنا سمٹنا پڑے گا۔ رات حسین تھی،
رات کی خاموشیاں حسین تھیں۔ دو دھیائی چاندنی میں آہستہ آہستہ منزل کی
جانب بڑھنے والا ہمارا قافلہ۔ ستاؤں اور خاموشیوں کی دنیا میں آواز
اور زندگی تقسیم کر رہا تھا۔ ایک جانب ہرے ہرے کھیت دور دور تک کھائی
دے رہے تھے۔ دوسری سمت ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی۔ پہاڑی کے نشیب
میں لوگ کہتے ہیں کہ شیوجی کا مندر ہے مندر کے نیچے لوگ کہتے ہیں ایک ندی
بہتی ہے جس کا پانی اس قدر ٹیٹھا ہے کہ کھلی ہوئی مصری معلوم دیتا ہے۔ ہاں
اور لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس کے اددلاد نہیں ہوئی وہ اس ندی کا پانی پی لے تو اس کے
اددلاد ہو جاتا یقینی ہے۔ خالہ بی کی مرعی بالکھ ہے۔ منی یقیناً سورج رہی ہے کہ
وہ خالہ بی سے کہے گی کہ وہ اپنی کلمو ہی مرعی کو اس ندیا کا پانی چوا آئے۔ اس نے
ٹنکو میاں سے اس بات کا تذکرہ کیا ہے۔ ٹنکو میاں کچھ سورج رہے ہیں۔

پھر یکایک چونک کر انھوں نے مٹی سے پوچھا ہے۔

”مٹی دیدی اگر خالہ بی کو بھی اس ندیا کا پانی پلا دیں تو پٹا پٹ انھیں بھی بچے ہو جائیں گے نا؟“

”شکرمیاں، مٹی پر تہربان ہیں۔ تب ہی تو مٹی دیدی کہا ہے۔۔۔ بات شکرمیاں نے معقولی کی ہے۔۔۔ مٹی کو یاد آیا کہ واقعی خود خالہ بی بھی تو بے اولاد ہیں۔۔۔ اور یہ بات ساری بیل گاڑی میں پھلجھڑیاں پھڑدار ہی ہے۔۔۔ سب ہنس رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے فقیر، ننھی ننھی لڑکیاں، بیلوں کی گھنٹیوں کی سرسائی، ٹن ٹنٹن۔۔۔ پیسوں کی چرخ چوں۔ گھوڑوں کے ٹاپوں کی ٹپ ٹپ۔۔۔ آوازوں کا یہ قافلہ خاموشیوں کے سینے میں اتر رہا ہے۔۔۔ دو متضاد کیفیتیں اپنا تضاد کھو رہی ہیں۔ جہاں مختلف آوازوں کے اس قافلے پر دودھیا پانی چاندنی میں سوکے ہوئے سائے کا گمان گزرتا ہے تو کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری چٹکی ہوئی چاندنی بول رہی ہے۔ کھیت بول رہے ہیں۔ جھومتے جھامتے درخت بول رہے ہیں۔ وہ پہاڑی بول رہی ہے جس کے نیچے شیعہ جی کا مندر رہے اور اس مندر تک پہنچانے والی پگھلندہ بول رہی ہے۔۔۔ سب چپ چاپ ہیں لیکن کامنات کی ہر شے کوئی خوبصورت سی سازش کر رہی ہے اور یہ سازش غالباً چٹکی ہوئی دودھ جیسی چاندنی کے خلاف ہو رہی ہے۔ اس کے حسین نشاط کے خلاف ہو رہی ہے جو اس نے جنگل کی ہر شے پر جما رکھا ہے اور غالباً اس سازش ہی کے نتیجے میں سورج کہیں دیر دیا دیا، چھپا چھپا چاندنی کے تعقب میں آگے بڑھ رہا ہو۔۔۔ لیکن وہ ان ساری باتوں سے بے نیاز ہے۔ اپنے ہی

حسن میں لگن۔

بانو آپا ہماری ہی بیل گاڑی میں بچوں میں گھری بیٹھی ہیں۔ ابھی ابھی تیرا
 میٹھی میٹھی باتیں۔۔۔ سبز بری کی کہانی جس کو کالے دیو سے پھڑانے کے لیے
 شہزادہ کا غلام سستی سستی کا پانی پی کر اور جنگل جنگل کی خاک چھان کر پوچھا تھا۔
 لیکن سبز بری کو کالے دیو نے مینا بنا کر بجزے میں قید کر دیا اور شہزادہ کا غلام
 پہلے اس بجزے کی تلاش میں سرگرداں و حیراں رہا تاکہ سبز بری کی زندگی
 محفوظ ہو جائے۔

کہانی کہتے کہتے بانو آپا کی نظر میں ادھر ادھر بھاگ جاتیں۔
 چمکنی ہوئی چاندنی میں بھک سہید گھوڑے پر بٹھایا جیسے پہننے ہوئے
 شہزادے۔ وہ بڑے پھلے لگ رہے ہیں۔۔۔۔۔ بھیا کا گھوڑا جتنا خوبصورت
 ہے اتنا ہی صحت مند، تند و تیز اور شیریں ہے۔ چلتا اس طرح ہے جیسے شراب
 پی کر تھوم رہا ہو۔ قدم بڑے متوالے متوالے ڈالتا ہے۔ ہر آواز پر کان
 کھڑے کر لیتا ہے۔ ہر چیز سے جھکتا ہے۔۔۔ منجے آگے ابا کی بیل گاڑی ہے
 اور ابا کی بیل گاڑی کے آگے پانچوں گھڑ سواہ ابی ابی تلواریں، سیام میں لٹکا
 باغیچہ کی سے بڑھ رہے ہیں۔ گھوڑے ان کے طبی صحت مند ہیں۔ چلتے ہوئے
 وہ بھی چوکنے چوکنے سے دکھائی پڑتے ہیں۔ لیکن بھائی جان کا گھوڑا کچھ زیادہ
 ہی جات و چر رہا ہے۔

اب بڑھٹ رہی ہے۔ وہ گاؤں جہاں ہمارا خیمہ نصب ہو چکا ہوگا
 چند ہی فرلانگ کے فاصلے پر رہ گیا ہے۔ ابا اپنا عمدہ سنبھالنے کے بعد پہلی بار

اس گاؤں کے دورے کے لیے آئے ہیں۔ یقیناً ان کا سواگت گاؤں کی رعایا اور
 سربراہ آدرہ لوگ اسی اہتمام سے کریں گے جس کو ہم نے ہر نئے گاؤں میں
 ایک ہی انداز سے ہوتے دیکھا ہے اور پھر تاشوں جھانجھنوں اور ٹہلوں کی گت
 پر قبیلے کی گھوڑی اپنا ناچ شروع کر دے گی اور تلوار نیام سے نکالے
 تیرہ چاروں گھڑ سواروں کے بیچ اپنی ناچتی اور تھرتی گھوڑی پر بہت
 نازاں نازاں مسکرائے گا۔ چاروں گھڑ سوار بھی اپنی تلواریں نیام سے نکالے
 جو کس ہو کر قبیلے کی گھوڑی کے اطراف چلیں گے۔

غالباً بانو آپا اب یہ سوچ رہی ہوں کہ ایسے میں دیکھنا بھیا اپنا گھوڑا
 کہاں رکھتے ہیں۔ یقیناً بھیا..... گھڑ سواروں کے آگے آگے رہیں گے
 مگر یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ گاؤں کی رعایا ابا کے ساتھ بھیا کو بھی پھولوں
 کے ہار پہنائے گی۔ اس لیے کہ بھیا ابا کے سب سے بڑے بیٹے ہیں۔ اتنے پیارے
 سے ہیں، شہر میں پڑھتے ہیں۔ پہلی بار ابا کے ساتھ دورے پر آ رہے ہیں
 — پتہ نہیں بانو آپا اس طرح سوچ رہی ہیں یا نہیں لیکن ٹہلو میاں تو بالکل ہی
 سوچ رہے تھے۔ جب انھوں نے منی سے اس طرح کی بات کی تو منی تالیاں
 بجانے لگی۔

”تم تو بہت ٹھیک سوچتے ہو ٹہلو“ منی نے کہا۔

”میں بولوں گی بانو آپا کو بھی پھول پہنا دو“ منی نے پھر اضافہ کیا۔

بانو آپا کان کی لوگوں تک سرخ سرخ ہو گئیں۔

”مجھے کیوں پھول پہناؤ گی؟“ انھوں نے منی کے گال پر چپت لگائی۔

بھیا یہ ساری باتیں بہت نہیں کس ریڈیو کے ذریعہ سن رہے تھے۔ اگھوڑا گھما پھرا کر ہماری سیل گاڑی کے پیچھے آئے۔

کہنے لگے ”میں ساری باتیں سن چکا ہوں۔ سنی کا جواب میں دوں گا۔“
بھیا آگے ہیں تو بانو آپا کی زبان ہمیشہ کی طرح گنگ ہو گئی ہے لیکن ہمیں
کی طرح ان کی آنکھیں بھیا سے بہت کچھ کہہ رہی ہوں گی۔

سبھوں نے تو صرف اتنا ہی دیکھا ہے کہ بانو آپا شرمنا رہی ہیں۔
پھر بھیا نے ٹنکومیاں کو اشارہ کیا۔

وہ سیل گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ایک دم پھل پڑے۔

بانو آپا چونک گئیں کہ ٹنکومیاں کو بیٹھے بیٹھے یہ کیا ہو گیا۔ وہ صحیح طور
ابھی کچھ سمجھ بھی نہ پائیں تھیں کہ ٹنکومیاں بھیا کے بازوؤں میں پھول رہے تھے۔
پھر مزے سے بھیا کے آگے گھوڑے پر سوار مسکرا رہے تھے۔

بھیا نے ان سے سرگوشی کی تو وہ پٹ پٹ آنکھیں مار رہے تھے۔

بھیا نے انھیں گدگدایا تو وہ سنہیل کر کہنے لگے۔ بھیا پھول پہنیں گے تو بانو
آپا بھی پہنیں گی۔ اور ننگے تالیاں بجانے۔

بانو آپا نے بھیا کو گھور کر دیکھا تو مجھے ان کی آنکھوں میں محبت سے زیادہ
شکر کا بندہ نمایاں نظر آیا جیسے وہ ان کے اپنے اتنے ادیرا اٹھالیے جانے پر
بھیا کی ممنون احسان ہوں۔ لیکن اسی نگاہوں سے بھیا کو بانو آپا بہت کم دیکھنے
لگی تھیں۔ جب سے ہم لوگوں نے انھیں بانو آپا پکارنا شروع کر دیا تھا ہم
نے محسوس کیا تھا کہ انھیں بڑا اطمینان ہو گیا ہے۔ ایسا اطمینان جو آدمی کی کھوئی

ہوئی تو قیر کے داپس ملنے پر ہوتا ہے۔۔۔ لیکن آج باؤ آپا نے بھیا کو انھیں نظروں سے دیکھا جن نظروں سے وہ ان دنوں دیکھتی تھیں جب ہم انھیں صرت باؤ پکا کر دیتے تو ہمیں آج کی باؤ آپا بڑی مختلف نظر آئیں۔ اتنی مختلف کہ ان کا اصلی روپ تو یہی معلوم ہوا۔

پھر بھیا نے ٹنگومیاں کو بازو سے تھام کر بیل گاڑی میں اس طرح چھوڑ دیا جیسے پانی سے بھرے جگہ میں کوئی برت چھوڑ دینا ہو اور گھوڑے کو اسے لگا کر ہماری بیل گاڑی سے آگے نکل گئے۔ ٹنگومیاں نے چپکے سے ایک کاغذ کا ٹکڑا باؤ آپا کے ہاتھ میں تھا دیا تو وہ خوشی اور خوف کے ملے جلے جذبات سے کانپ ہی رہی تھیں۔

کاغذ میں کیا لکھا تھا باؤ آپا جانیں یا پھر بھیا۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ کاغذ پہلا کاغذ ہو گا جو بھیا کی طرف سے باؤ آپا کے نام آیا تھا۔

پھر بعد میں ٹنگومیاں مستقل طور پر یہ خدمات انجام دیں گے۔۔۔ ایسا مبرا اندازہ تھا۔

اب ہمارا قافلہ ایک ہرے بھرے کھیت کے باگن متوازی بیل ریل پر ابھرتا تھا کھیت سفرک سے بائیں ملا ہوا ہے۔ چلتے چلتے بیل ابھی گرونیں جھٹکا کو کھیت میں لہواتے پودوں پر مہر مار رہے جاتے ہیں۔۔۔ ایسے میں بیل گاڑی کا اگلا حصہ ایک سمت میں جھک جاتا ہے۔ ٹنگومیاں اور بیل کافی مٹلاؤ ہو رہے ہیں اور ٹنگومیاں مسرت اور خوف کے ملے جلے جذبات سے باؤ آپا سے چمٹ جاتے ہیں۔

گاڑی بان آواز نکالتا ہے۔ بیلوں کو دھککا جاسیے، ڈراتا ہے اس پر بھی وہ نہیں مانتے ہیں تو انھیں بیٹھا ہے پھر پکا رتلا ہے اور کبھی کبھی تو کھنکھائیے کا موقع دے دیتا ہے۔ بے زبان جانوروں پر زیادہ جبر اس کو گوارا نہیں ہے یا پھر کھیت واسے کا کھوڑا سا نقصان اپنے مفاد کے مد نظر اس کو گوارا ہے۔ اس کے بیل بکھر کے ہیں کھیت پر چلتے چلتے سہو مار لینے سے بیلوں کی بھوک نہیں مٹتی۔ لیکن گاڑی بان کی تسلی ہو جاتی ہے۔ ان ساری باتوں کے باوجود آدمی برا نہیں ہے۔

سامان جن بیل گاڑی پر لدا ہے شاید اس کا گاڑی بان پٹلے سر دلیں مشہور رشاعرہ جاتی کا گیت اسی کے میں لگا رہا ہے جس دھن میں شاعر خود نظم سناتا تھا

آنتاں سہتا جا، بنتا جا، گانا جا
بندڑی واسے

یہ گیت دکن کی کھڑی بولی میں لکھا گیا ہے۔ گاڑی بان کی آواز ہمیں صاف سنائی دے رہی ہے۔ اس گیت سے ہمیں اس بات کا احساس ہوا ہے کہ ہمارے بیلوں کے گلوں میں گھنٹیاں لٹن ٹٹنا رہی ہیں۔ یہ گھنٹیاں اس وقت سے نکال رہی ہیں جس وقت ہمارا قافلہ روانہ ہوا تھا۔ غیر محسوس طور پر ہم ان کی آواز بہت دیر سے سن رہے ہیں لیکن گاڑی بان کی آواز سے مل کر ان میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ ہمیں احساس دلا رہی ہے کہ گھنٹیوں کی یہ آواز گاڑی بانوں کی تنہائیوں کی رفیق ہے۔ رستوں کی رہبر ہے۔ گیتوں

کی سنگت ہے۔

اوسے یہ آواز گاڑی بان کی منہں تھی۔ یہ تو بھیا نگا رہے تھے۔ سامان کی بیل گاڑی کی اوٹ میں چھپ کر انھوں نے یہ گیت چھیڑا تھا دھن اودھنے اگلے بھی تھی۔ ہم نے ان کی آواز نہ کی نہیں پہچانی۔

اب پرندے اپنے اپنے آشیانوں سے نکل رہے ہیں۔ رات کی چادر فضا نے بسیط سے کوئی سچ ٹیکوں میں پکڑ کر بڑی نزاکت اور احتیاط سے کھینچ رہا ہے ایک ایک شے آہستہ آہستہ نمودار ہو رہی ہے۔

بانو آپا نے کہانی ادھوری چھوڑ دی ہے۔ اس ادھوری کہانی کو مکمل کرنے کی نہ اس وقت ان کی خواہش ہے اور نہ ہم سب ہی اس پر مائل ہیں۔

بھیا اپنا گھوڑا پھر ہماری بیل گاڑی سے پیچھے آئے ہیں۔ شاید وہ اس موقع کی تاک میں رہتے ہیں کہ ابا اور امی کی نظروں سے نکل کر کسی طرح ہم سے چھیڑ چھا کر گریبا۔ ہم سب انھیں پیاتے ہیں۔ لیکن ہماری بیل گاڑی میں ان کی اپنی کوئی اور شے بھی ہے جو شاید انھیں ہم سب کے زیادہ پیاری ہے۔

آتے ہی انھوں نے ٹسکومیاں سے پوچھا۔

”اے میاں ٹسکو“

”کیسے جی“

”بانو رانی کو ہماری چھٹی پہنچ گئی؟“

”ہاں جی“

”شاباش“

”کہو کیا مانگتے ہو۔“ منی نے ٹنکو میاں کو کچھ آہستہ سے سکھا پڑھا دیا۔
 ”باذرائی کو مانگتا ہوں ہی“

بھیا بے اختیار سر کرادیے۔ بانو آپا کے تو چھوٹا سا تہقہ نکلی پڑا جو گھنٹیوں کی
 طرح سر ہلا تھا۔

منی کہنے لگی۔ ”بھیا آؤ آپ بانو آپا کو لے کر کیا کریں گے۔“
 بھیا نے کہا۔ ”دھن بناؤں گا۔۔۔ پھر باذرائی کو ڈوگرا بھر کے پکے ہوں گے۔“
 ”ٹیس، پیس، ادوں ٹوں۔۔۔ اشنٹ“
 ”یہ کیا بات ہوئی بھیا۔“ ٹنکو میاں نے پوچھا۔
 بھیا کہنے لگے۔ ”پہلا بچہ کئے گا ٹیس“

”دوسرا کئے گا۔۔۔ پیس“

”تیسرا کئے گا۔۔۔ ٹوں“

”چوتھا کئے گا۔۔۔ ادوں“

”ادرم ہم انھیں ڈرانے کے لیے کہیں گے اشنٹ“

”پھر کیا ہو گا بھیا“ منی پوچھ بیٹھی۔

”پھر یہ ہو گا کہ یہ سارے بچے دوڑ کر باذرائی کی گود میں جا دیں گے۔“

باذرائی بچوں سے جب یہ سنیں گی کہ ہم غصے میں ہیں تو وہ بھی ڈر جائے گی۔ اور جب

ہم اس کے پاس پہنچیں گے تو وہ مارے خوف کے اس طرح سلام کرے گی۔“

اور بھیا لگے گھوڑے پر سے جھک جھک کر سلام کرنے، بالکل اسی طرح جیسے

بارات کے وقت دوہا میاں کرتے ہیں۔

بانو آپا دوپٹہ مسخر پر رکھ کر تنہا رہیں۔

مشکومیاں تالیاں بجانے لگے۔

سنی شاداں و فرحاں اس طرح مطمئن ہو گئی جیسے اس کو اچھی طرح سمجھ میں آ گیا ہو کہ بھیا کے لیے بانو آپا کا ایک مصرت یہ بھی تو ہے۔
سامان کی بچھنی پیل گاڑی کے ہیں بدن کہ راستے سے ہٹ گئے تو بھیا نے جھٹ سے لگام ڈھیلی کی اور کہیں اوٹ میں ہم سے جا چھپے۔

— منزل —

رات نے بہت ساری چیزوں کو چھپا رکھا تھا تو ہم نے بھی اپنی نظروں کی حفاظت کی تھی کہ وہ رات کی تہائیوں میں ادھر ادھر بھٹکیں اور بانو آپا سے کہانی کی فرمائش کی گئی تھی اور اس طرح فیض کی کھڑکیاں بند کر کے کافوں کے درپے کھول دیے گئے تھے۔ رات کا بڑا حصہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو کر ہم نے سبز پری اور شہزادہ گلغام کے وطن کے شاداب مرغزاروں اور بے آب و گیاہ صحراؤں میں گزرا تھا۔ لیکن اب فطرت نے آنکھوں کیلئے نظارے فراہم کر دیے ہیں تو ہم نے بھی اپنی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مل کر تیار کر لیا ہے۔ ہر شے ہمیں نہ صرف دعوتِ نظارہ دے رہی ہے بلکہ ہمیں چھپڑ رہی ہے، سلام کر رہی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ ہماری عمروں کا تقاضا ہو کہ ہر شے ہمیں چھپڑتی ہوئی خصوصاً نور ہی ہے یا پھر سبز پری اور گلغام شہزادے کے سحر زدہ ماحول سے بازگشت اس کا سبب ہو یا پھر اس کا کوئی سبب ہو ہی نہیں۔ اس لیے کہ

بڑھتی ہے تو کوئی ایسی چیز جنم لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جس کا زندگی سے بڑا
گہرا تعلق ہے۔ اور یقیناً خاطر بھی تو آدمی کو سیدار کر سکتا ہے، اس کا سنا ہے،
دیکھا رسکتا ہے۔

بہر حال باؤ آپا نے کہانی اور دھوری چھوڑ دی تھی۔ بھیا ہمیں کبھی نظر
آتے تھے، کبھی بیل گاڑیوں کی اورٹ میں یا گھڑ سواروں کی آڑ میں چھپ جاتے
تھے۔ یا کبھی سامنے آ جاتے تھے تو ہم انہیں دیکھ نہیں رہے تھے۔ باؤ آپا البتہ
سامنے جہاں سے بے نیاز ہو کر صرف انہیں کو دیکھ رہی ہوں گی۔ لیکن ان کی
نظریں اب بھی پٹی ہیں، پھر بھی ان کی نیچی نظروں کا کیا ٹھکانا۔

وہ جو سامنے آموں اور ناروں کے بھاڑوں کا جھنڈ ہے۔ وہاں ایک
بادلی بھی ہے اور رہٹ چل رہا ہے۔ یہ رہٹ ہم سے اتنا قریب ہے کہ کھر
پڑے ڈول سے پانی کے بادلی میں داییں گرنے کی دلکش آواز دہکتی ہے، سنائی
دے رہا ہے۔ جی تو یہ چاہتا ہے کہ منٹ بھر کے لیے ہی سہی اس باغیچے میں
ٹھہر جائیں۔ سمجھنا تھا یہیں دھوکے جائیں۔ ناشتہ یہیں کیا جائے لیکن یہ تجھ
آپا کے سامنے کبھی کس طرح جا سکتی ہے۔

ہم نے باؤ آپا سے شورہ کیا ہے، انہوں نے کچھ پس و پیش کے بعد بھیا
کے ذریعہ ابا کو آمادہ کرنے کا وعدہ کر لیا ہے لیکن بھیا دکھائی نہیں دے رہے
ہیں۔ ہم نے آگے کے گاڑی بان سے کہہ دیا ہے کہ وہ گھڑ سواروں کے ساتھ ہوں
تو انہیں یہاں بھجوا دے۔ لیکن وہ وہاں نہیں ہیں۔ آموں کے اس جھنڈ کے نشیب
میں ایک تالاب کھائی دے رہا ہے۔ تالاب کے کنارے کچھ بگلے بیٹھے ہوئے ہیں۔

کچھ اڑنے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ جنگلی بھینس اور مرغیاں تیرتی پھر رہی ہیں۔ سورج اب اپنی نرم نرم کرنیں زمین پر پھیلا کر رہا ہے۔ تالاب کا پانی اور پرندوں کے پر چمک اٹھتے ہیں۔ تالاب کے تینوں جانب دھان کے کھمبے کھیت ہیں۔ کھیتوں میں کچھ ہی ذرا چلے پر دو آدمی بے حس و حرکت کھڑے ہیں۔ یہ آدمی نہیں ہیں۔ آدمیوں کا سواٹنگ ہے۔ پرندوں کو ڈرانے کے لیے کسانوں نے بانس یا کنڑی کی ٹٹریاں سجائیں بنا کر ان پر پھٹے پائے لٹا دیے اور چھوٹے ڈال رکھے ہیں اور ان کے اوپر ہی سروں پر آنکھیں اور منہ اوپر دیکھتے ہیں۔

ایک ایک بندہ وق چھنے کی آواز دے رہا ہے تو وہ اپنی طرف کرتی ہے۔
 باؤ کیا کہیں کھوئی ہوئی بھینس۔ وہ ایک سو سے سے جاگ پڑی
 ہیں اور اسی آواز کی جانب دیکھ رہا ہیں۔

بھینس تالاب پر دوچار کھڑی کھڑی اب بھی ہیں گر گئی ہیں۔ ایک آدمی
 کنارے پر اپنی بندہ وق پکیر کے کرتا تالاب میں پھانک لگا رہا ہے۔ یہ آدمی کھانک
 اب نظر آیا ہے۔ جانے وہ اب تک کہاں چھپا ہوا تھا۔

”تھا اے بھیا کہاں ہیں؟“ یہ باؤ آپا کی آواز ہے لیکن وہ اس
 قدر آہستہ چڑھ رہا ہے جیسے خود اپنے آپ سے بند چھ رہا ہوں۔

لیکن ہم میں سے کسی نے ان کا جواب نہیں دیا۔ ہم خوبیت کے عالم میں
 ایک عجوبہ دیکھ رہے ہیں۔ ایک انہونی بات ہمارے سامنے ہو رہی ہے۔ انہم
 حیران و ششدر ہیں۔ ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا ہے۔ ایک درخت
 چل رہا ہے ہر ابھر اس سرسبز و شاداب درخت تالاب کے کنارے کنارے

طراف درختوں کی شاخوں پر اور ہرے ہرے پتے بانڈھ رکھے ہیں۔
 صدف سانس لینے کے لیے ناک اور دیکھنے کے لیے آنکھیں پتوں سے ڈھکی ہوئی نہیں
 ہیں۔ اس کا سر بھی پتوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ قنبر علی نے یہ بھی بتایا کہ یہ درخت آ
 آہستہ آہستہ تالاب میں گھٹنوں گھٹنوں پانی تک اتر جائے گا۔ پھر وہ فیر کرے گا
 ۔ کوئی بٹیا مرغانی گرے گی تو اس شکاری کا کوئی ساتھی چلانگ لگا کر تالاب
 میں کود پڑے گا اور بٹیا کے برے آگے گا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے ہم نے بٹوں کو
 گیسے ہوئے دیکھا بھی تو تھا۔

بانو آپا سب کچھ سن رہی ہیں۔ لیکن ان کی آنکھیں کسی کو تلاش کر رہی ہیں
 قنبر علی اور پتہ نہیں کیا کیا انکشافات کرتا لیکن بانو آپا یہ پوچھتی ہیں۔
 چھوٹے صاحب۔ گھوڑے پر کہیں گئے ہیں کیا؟

”ہاں بی بی۔ وہ تالاب ہی کی طرف انھیں شکار یوں کو دیکھنے کے لیے
 گئے تھے۔ کیا ابھی واپس نہیں ہوئے۔“ قنبر علی نے پوچھا۔

”لوٹ آتے تو نظر نہ آتے؟“ بانو آپا کے لیے میں اب بھی وہ نرمی
 نہ ملتی جو ان کی گفتگو کا خاصہ ہے۔

قنبر علی پھر کہنے لگا۔ ”گاؤں اب یہاں سے کوئی ڈیڑھ دو فرلانگ پر
 رہ گیا ہے۔ قنبر علی نے ہونے کی وجہ سے گھر دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔
 میں صاب کی آمد کی اطلاع کر آیا ہوں۔ لوگ سو آگے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ وہ
 باجے اور پھولوں کے بارے کر آ رہے ہیں۔ وہ چھوٹے صاحب کی بھی گپوشی
 کرنا چاہتے ہیں۔“

شکوہیاں اور سختی تالیاں بجانے لگے۔

لاؤ لاؤ لاؤ۔۔۔ مٹی پھولوں میں سما جاتی ہے۔۔۔ وہ بار بار ٹنکومیاں سے کہہ رہی ہے۔ تم بڑے سیانے ہو گئے ٹنکو۔۔۔ تم تو پہلے ہی سے کہہ رہے تھے۔

بالو آپا کا چہرہ باغ دہسار ہو رہا ہے۔ ان کی آنکھیں جگمگنے کی طرح جگمگ رہی ہیں۔ ان کے عارض پر گلاب کھل گئے ہیں۔

”میں ذرا چھوٹے صاب کو اس بات کی اطلاع کر دوں۔۔۔“ قبر علی نے گھوڑی کو رینگائی اور ہوا سے باتیں کرتا یا غیجے کی سمت روانہ ہو گیا۔

شاداب گھیتوں کے درمیان سے ہو کر اس کی گھوڑی پگھلائی ہوئی پر اس قدر تیزی سے جا رہی تھی جیسے میدان میں دوڑ رہی ہو۔

چلتا پھرتا درخت تالاب کے پانی میں واہی اتر گیا ہے۔ اب وہ بالکل خاموش کھڑا ہے۔ ہماری بیل گاڑیاں سیدھی جانب گھومتی ہوئی ذرا فراق پر آگئی ہیں۔ یہاں سے نظر زیادہ دلکش زیادہ واضح ہو گیا ہے۔

چلتا پھرتا درخت جو اب ساکن کھڑا ہوا ہے اس کی بائیں جانب ایک ٹہنی پھوٹ رہی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ ٹہنی درخت کے اوپری سہ تک پہنچ گئی ہے۔ بلاشبہ یہ بندوق ہے جس کو شکاری نے پتوں میں پھپھایا ہے۔ ہمیں

صرف دھماکہ سنائی دیا ہے اور چلتے پھرتے درخت کے بالکل مقابل ایک آدمی پھلانگ لگا کر تالاب میں بڑی بے جگری سے پانی کا ٹپا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔

قبر علی کی گھوڑی ذرا سانشیب میں ہمیں دکھائی دے رہی ہے۔

وہ تو واپس لوٹ رہا ہے۔ ہرے بھرے کھیتوں کے بچوں نے پگڑی بندھی
پر اپنی گھوڑی کو اس طرح سرپٹ دوڑاتا ہوا یہ نوجوان بھوسے بھلاتے
کھیتوں میں کیسا بھلائیگ رہا ہے۔

دیکھتے کے دیکھتے وہ ہمارے قافلے کے قریب پہنچ گیا۔

شہر د۔ اس نے قریب قریب چھ کر کہا۔

”جھوٹے صاحب کے سینے میں درد ہے وہ بے ہوش ہو گئے ہیں۔“

پلک جھپکتے ہیں سب گھر سوار قہقہے ہنسی کے پتے اپنے گھوڑے سرپٹ
دوڑاتے کھیتوں میں گزرتے ہیں۔ ایک گھوڑے پر ابابھی سوار ہیں۔

ہم لوگ سب کے سب ہیں گاڑیوں سے کو دبڑے ہیں اور غیب
میں ہی سمت بھاگ رہے ہیں جس طرف گھر سوار گئے ہیں۔ بانو کیا
امی کا لاکھ تھا سب سے آگے آگے آگے ہیں۔

باجوں کی آواز ہمیں صاف سنائی دے رہی ہے۔ شاید گاؤں کے
لوگ ہمارے سواگت کو آ رہے ہیں۔

پھر ہمیں جیسے کچھ سمجھائی نہیں دے رہا۔ کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے
لیکن کوئی کہہ رہا ہے کسی کا حرکت قلب بند ہونے سے — شاید یہ ابابھی
آواز ہے جو ہر شکل ان کے رندھے ہوئے گلے سے نکل سکی ہے۔

ایک در آواز اس آواز کے ساتھ کہیں دور سے آرہی ہے۔

بانو میری — بانو میری۔

ٹنکو میاں سے کوئی کہہ رہا ہے کہ بھیا چاند میں گئے ہیں۔

باتو آپا سو سچ نہی ہیں چاند تک پہنچنے والا آدمی، آدمی کے دل تک
 کب پہنچے گا، اس کی زندگی تک کب پہنچے گا۔

میرے ذہن میں بھی مستقبل کا کچھ عجیب دھندلا سا خاکہ ابھر رہا ہے۔
 یہ کہانی ہے۔ کوئی حقیقت تو ہے نہیں۔۔۔ پھر کسی کہانی کو اس طرح
 غیر متوقع طور پر ختم نہیں ہو جانا چاہیے۔۔۔
 لیکن میں کیا کر دوں بھیا مر گئے ہیں۔

پانی کے چرل

بھم بھم کرتی اوزر جہاں کو دیکھ آئے تو جیسے نیندوں کے خزانے کی گٹھڑی بنا
چپکے سے اس کی نذر کر دیا۔ اس طرح کہ خود اسے بھی خبر نہ ہوئی کہ کسی نے اپنا
سب کچھ تاج دیا ہے لیکن طرہ دار علی خاں کے لیے پھر کوئی شب ایسی نہ ہوئی جس کی
سم کرنے میں آنکھوں نے موافق نہ ٹھاکے ہوں۔ سب نے دیکھا کہ بوجھیں بیوٹوں کے نیچے
کچھ سرخیاں اس طرح چھپ کر طرہ دار علی خاں کی آنکھوں میں پرچ بس گئی ہیں کہ جیسے
دنیا بھر میں کہیں اور انھیں جگہ ہی نہ ملتی۔

اتنی بڑی جھڑی تو انھیں نہیں کہ بھم بھم کرتی دیکھا اور بڑھ کر گود میں اٹھالیا اور
چپکے خدوت کدے کی زینت بنالی۔ شہر کے راجے آنکھیں کچھا رہے تھے۔
نواب زادوں کی ڈوبیاں ہاتھوں ہاتھ لے رہی تھیں جے یور سے تین ہینس حیدر آباد

ہو چکیں اور جیسے سارے شہر میں غل غپاڑہ مچ گیا۔ غدر ہو گیا۔

نواب بھکڑ میاں کی نواب کی میاں سے بڑی بہن کے لیے ایسی ان بن ہوئی کہ
بھری انجن میں تلواریں کھینچ گئیں۔ یہ اور بات۔ یہ کہ تلواریں چلیں نہیں اس لیے کہ
دو ذول ہی صرف تلواریں کھینچنا جانتے تھے۔ چلانے کے لیے پسرے دادوں کی کمی نہ
تھی جو یہ معمولی کام بھی وہی کر لیتے۔ چلو اچھا ہی ہونا۔ در نہ کیا خون خرابہ ہوتے۔
بچپن چپکے سے جوانی کی سرحدوں میں داخل ہوا تو نینوں کے بان اور ابد و دُوں
کی کٹ رنے اس بری طرح ٹھانک گیا کہ سب کی تلواریں اپنی اپنی نیام میں رہی
دھری دھری لڑناک خود وہ ہو گئیں۔

لیکن طر حدار علی خاں نے پہلی بار ہی بھری انجن میں پلکیں بھپکائیں تو اتنی
چکا چونڈ تھی کہ انجن سے اٹھنے اٹھنے تک انھیں ساری دنیا تاریک تاریک سی دیرا
دیراں سی دکھائی دینے لگی۔ دل کی بستی میں جیسے جراحاتوں نے پڑاؤ ڈال دیا تھا۔
نشتروں نے طنائیں کھینچ لی تھیں چپکے چپکے سلگتے رہتا اور ات نہ کرنا۔ دھبی دھبی
آج نہ شعلہ بن کر بسکی نہ راکھ کا ڈھیر کا ڈھیر بن کر ٹھنڈی ہوئی۔

کوئی محفل ہو کوئی انجن ہو، دو آنکھیں جھم جھم کرئی اور جہاں کو تک جاتیں۔
محفل پر خواست ہوتی تو گزرنے والے کے دل پر سب کچھ گزرجاتی لیکن انور جہاں
کو خبر بھی نہ ہوتی کہ کوئی اس بھری پڑی دنیا میں ان کی بادولت تنہا تنہا ہو کر
رہ گیا ہے۔

پھر طر حدار علی خاں کی آنکھوں میں ان کے اپنے آنسو رات رات بھر کنکر
بن کر ٹھکنے لگے، اور ہر تار بستر خار بستر ہو کر رہ گیا۔

ہوس کی طرح کسی پایاب دریا کے کنارے کنارے چلنا تو اکتھیں تھا
 نہیں وہ تو سرتابہ قدم محبت نہی محبت بن کر ڈوب جانا چاہتے تھے، ہوس اور
 محبت کی نگاہ میں کتنا چھوٹا سا فرق ہوتے ہوئے بھی کتنا بڑا فرق ہے۔ کوئی قافلہ
 نہ ہوتے ہوئے بھی کس قدر فاصلہ ہے۔ یہ بات طر حدار علی خاں کی نظروں سے
 صاف ظاہر ہو جاتی۔ دوسری یہ شمار نظریں تو انور جہاں کو محفل میں کمرچی کے
 جال کی طرح اپنے تالے بانے میں محصور کر لیتیں لیکن طر حدار علی خاں کی نظر کچھ
 اس طرح پھیلائی جاتی تھی جیسے اس نظر سے انور جہاں کو کچھ ناسی مرد کے پس
 میں ہی نہ ہو۔ جیسے لوہے کے زنگ خوردہ تاروں کے گچھے میں چاندی کا شفا
 تار بھی اچھ کر رہ گیا ہو۔

ایک بار ایک محفل سے انور جہاں بھر اد سے کرکٹ ری ٹھٹھیں سنا نہ رہے
 طلبہ، ستار اور سارنگی، گچھی میں رکھ کر انور جہاں کے منتظر تھے۔ وہ محفل سے
 اٹھ کر گچی ٹنگ ہو چکے کیسے پچانگ کی طرف بڑھیں تو دالان ادویش دالان
 سے ہو کر اکتھیں صحن سے گزرنے لگا۔ صحن سے ہو کر یہ وہ ایک در دالان میں اکتھیں
 ہوئیں، تو ذہن تو انداز کے بھرے سے ہو کر اکتھیں گزرنے لگا، کیونکہ پورے گچھے کی
 مرست ہو رہی تھی اور اس طرح باہر نکلنے کا اصلی راستہ بند تھا جب وہ بھرے
 ہوئے تھیں تو دباؤ جیسے ڈیوڑھی بھر کے اجالے سسک سسک کر دم توڑ رہے تھے۔
 کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہی حجرہ ساری ڈیوڑھی کا مستقبل ہے جہاں ذہن و اند
 کی نشست کے لیے چٹائی اڑھی ہوئی تھیں۔

انور جہاں نے ادھر حجرے میں قدم رکھا ادھر کوئی چپکے سے بڑھ کر ان کے

مقابل آگیا۔ وہ بھییں کہ بے کوئی عاشق مزاج جو اس طرح پھیڑ پھیا ڈکڑا رہا ہے۔ لیکن یہاں تو فتنہ ہی بدلا ہوا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ایک اچھا خاصا مرد اور جہاں کے آگے دوڑاؤ ہو گیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے قدم پکڑ لیے اور سر جھکا کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور جہاں ہر جگہ کے لیے تیار تھیں۔ انھیں سر دیکھنا ہیوں سے تڑپ کر نکل جانا تو آتا تھا۔ وہ یہ تو بانہن تھیں کہ طاقتور سے طاقتور و بختہ ناشائستگی کا مظاہرہ کریں تو کس بیوردی سے وہ بختہ جھٹکا۔ دیے جاسکتے ہیں کہ پھر کسی حرکت کی جواز تھی نہ ہو۔ لیکن اس حملے سے کس طرح بچ بھگنا چاہیے، اور جہاں نے کچھ نہ سوچا تھا۔ نہ کسی نے سکا یا ہی تھا۔ طرحدار علی خاں کے آفسیو تھے کہ اس قدروں کو بھگورے تھے اور جہاں پر بھیجے سکتے کا غامطاری تھا۔ وہ نہ کچھ پوچھ سکتی تھیں نہ بھجک کر طرحدار علی خاں کو اپنے قدموں سے اٹھا سکتی تھیں۔ بوکھلا بیٹ ہیں آخر کار انھوں نے بھجک کر اٹھانا چاہا تو ہاتھوں کا سہارا پایا کہ طرحدار علی خاں نے اور جہاں کے بختہ تمام لیے اور ان کو آنکھوں سے مل کر آنسوؤں سے تر کر دیا۔

بر وقت تمام اور جہاں نے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں اس قدر دل گیر کیوں ہیں۔ طرحدار علی خاں جواباً اتنا کہہ سکے کہ تجھے میری زندگی دے دو جو پہلی نظر ہی میں میں نے تمھارے قدموں میں ڈال دی ہے۔ ورنہ میں مرجاؤں گا، میں بھگتا رہے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

اور جہاں کے ذہن میں مرنے والوں کی بڑی لمبی چوڑی سی فہرست محفوظ تھی۔ لیکن یہ نہیں انھوں نے طرحدار علی خاں کا نام اس فہرست میں کیوں شامل

نہیں کیا۔ کہنے لگیں، آپ میرے گھر تشریف لائیں، مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوگی اور ایک چھپا کے سے حجرے کو پار کر کے باہر نکل گئیں۔

اندھیرے میں انھوں نے ٹھیک سے دیکھا بھی نہ تھا کہ یہ کون فوجوان ہے جو اس طرح گرہ کر ڈار رہا ہے کبھی تک پہنچ کر انھوں نے گھوم کر دیکھا تو حصارِ علی خاں انھیں اس طرح تک رہے تھے جیسے بچہ کھلوان کو تکتا ہے اور واقعی حصارِ علی خاں تھے بھی حصار۔

انور جہاں کو کوئی سحر دمی نہیں ہوئی اور کبھی تڑ تڑ کرتے آگے بڑھ گئی۔ حصارِ علی خاں ایک نہیں ہزار بار انور جہاں کے گھر گئے۔ پاؤں سے نہیں سر سے چل کر۔ اور پھر ایک بار ایسے گئے کہ بس ادھر ہی کے ہو رہے۔ وہ چلتی پھرتی تو آپ آنکھیں بچھاتے۔ وہ بٹھی گلو ریاں بناتی رہتیں تو آپ سو سو طرح شمار ہوتے رہتے۔ وہ سو باتیں تو بس بیٹھے چپ بیاب تکا کرتے۔ پھر یکا یکا پیرز پر آنکھیں ملنے لگتے۔ وہ پیر سمیٹ لیتیں تو خوش ہو کر آنکوش میں لے لیتے۔

پھر چپکے چپکے نکاح کے دیوول کے بدلے میں انور جہاں بالکل حصارِ علی خاں کی جاکم بن گئیں۔ وہ انھیں اب جاگم کہہ کر پکارتے۔ انور جہاں کچھ اس طرح حصارِ علی خاں سے وابستہ ہوئیں کہ دیکھنے والے بلا کسی لاد پٹیٹ کے کہہ اٹھتے کہ انور جہاں بنی ہی اس واسطے تھیں کہ کسی ایک کی ہو کر رہیں۔ کسی ایک دل میں سکون اور اطمینان سے بس اس طرح براہیں کہ انھیں دنیا کی کچھ خبر ہی نہ ہو۔ اور ہوا بھی یہی۔

وہ حصارِ علی خاں میں کھو گئیں اور حصارِ علی خاں ان میں کھو گئے۔

لیکن ہم سے پہلے ہی بہت سے لوگ لکھ گئے ہیں کہ محبت اس دنیا میں یردان

نہیں پڑھ سکتی۔ چنانچہ انور جہاں کے چھوٹے سے کنبے میں وہ ادھم بچہ وہ ہنگامے ہوئے وہ وہ فتنے کھڑے ہوئے کہ الحفیظ والامان۔

بات کچھ اتنی غیر اہم تھی تو نہ تھی جو بالکل ہی نظر انداز کر دی جاتی! اپنا وطن چھوڑ کر گھر بار پھونک کر بے پور سے حیدر آباد کو اس کنبے نے ہجرت کی تھی۔ کیا کیا سوچا تھا کہ زندگی کی بہاریں اپنی ہی چار دیواری میں مقید ہو کر رہ جائیں گی۔ ایک نہیں دو نہیں۔ تین بہنیں تھیں۔ پھر تینوں بھی ایسی کہ ایک پر دوسرے کو ترجیح دینا بجائے خود بار یکا بیٹی کے فن کا کمال تھا۔ اب گھر والے اگر اس طرح سوچیں کہ بے پور سے حسن کی ساری دولت سمیٹ کر ان کا قافلہ سوداگری کرنے حیدر آباد جیسے متمول شہر میں آن بسا تھا کہ ایک دولت کا دوسری دولت سے تبادلہ ہی تو ہو گا۔ لیکن یہاں آ کر اپنی پونجی جیسے کنکالوں کے ہاتھوں لٹ گئی۔ کچھ باقی رہ گئی تھی سو اس کا بھی کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ پتہ نہیں کہ کون کس کے گھر بیٹھ جائے۔ یوں گھر بیٹھنا ہی اگر زندگی کا مقصد تھا تو کون اپنا پیٹ کاٹ کر تان سر کے فن پر سب کچھ کنجا در کرتا۔ بھئی آس تو یہی تھی تاکہ تینوں کی تینوں ہندوستان بھر میں نام پیدا کر لیں گی۔ اسٹریماں نے صورت دی تھی، گلا دیا تھا۔ بانی جی نے اپنا سارا اثاثہ پھونک کر کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی۔ سارے کا سارا فن جیسے گھول کر تینوں بہنوں کو اپنے ہاتھ سے بانی جی نے اس طرح پلا لیا تھا کہ ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہو۔ اور حیدر آباد پہنچ کر ابھی پُر نہ نکالے بھی نہ تھے کہ انور جہاں، طر حدار علی خاں کی ہو کر رہ گئیں، بانی جی کو زانے نے پرکھا تھا، بدلتا تھا، بالکل اس طرح جس طرح بانی جی نے خود زمانے کو

پر کھاتھا اور برتا تھا۔۔۔ طر حدار علی خاں کے عشق کا نالٹک ظاہر ہے انہیں
ایک آنکھ نہ بھایا۔۔۔ صاحبزادے لٹو ہو گئے رکھتے تو کوئی مضائقہ نہ تھا
۔۔۔ گھر بھونک کر دنیا میں نام کرتے اور اس طرح تو بانی ججی کی بن آتی۔
لیکن یہاں تو لیل و نہار ہی دوسرے تھے، شام و سحر ہی بے ڈھب تھے۔
نہ ہینگ لگی تھی نہ پھنگری اور طر حدار علی خاں کے عشق کا جادو تھا کہ انہوں
کے سر پر ٹھ کر بولنے لگا تھا۔

کدھر سنہ مری، مٹی کی گرٹیا جیسی لڑکی اب گز گز بھر کی زبان نکال کر
دو ٹوک باتیں کرتی۔ دنیا بھر کی مسجدوں کے ملا۔ نے مر گئے رکھتے اور سبھوں نے
دیران مسجدوں کی جانا زیں سمیٹ کر انور جہاں کے حوالے کی تھیں جو وہ با
بے بات کے مصلے اچھا کر بیٹھ جاتیں۔ دونوں ہاتھ اور پر اٹھا کر پھت کو
تکتیں، پھر ٹپ ٹپ دو چار آنسو گرتے ہوئے ٹوٹتے تاروں کی مانند
سارے جاک کی آنکھوں کو دکھائی دیتے۔ رہ گئیں دعائیں، ان کے قبول
ہونے نہ ہونے کی بات تو سانچا بادشاہ ہی جانے۔

بانی ججی نے سو سو طرح سے فتنے اٹھائے، ہنگامے کھڑے کیے۔ کوئی تذکرہ
نہ چھوڑی کہ انور جہاں، طر حدار علی خاں کے چنگل سے نکل سکے۔ لیکن خدا
معلوم ان کھوڑے سے دونوں کی یک جالی میں طر حدار علی خاں نے کیا کیا
سبق پڑھایا تھا کہ انور جہاں صاف صاف کہہ اٹھتیں کہ میں باز آئی اس
زندگی سے جس کا راستہ سیدھے جہنم کو جاتا ہے۔

اور بانی ججی جیسے انور جہاں کو سیدھے جہنم کو لے جانے پر تلی بیٹھی تھیں۔

وہ بڑی گراوٹ پر اتر آئی تھیں کہنے لگیں پہلی بار جس خصم کی آغوش گرمائی تھی وہ تو نہ ہوا سب کچھ تیرا۔ کہتی تھی میں کسی پجرے کا بچھی نہیں ہوں جو اپنے کچش کاٹ کر بیٹھ رہوں۔ میری کلا، میرا فن کیا سب کچھ ان کے ساتھ ہی بیٹھ رہے گا۔ اور اب اس باوے لونڈے کے پیچھے اس طرح دیوانی ہوئی ہے کہ بات شروع ہو تو ساپنے بادشاہ کی دہائی سے اور بات ختم ہو تو ساپنے بادشاہ کی دہائی پر۔ اور وہ بھی مت مارا، مجنوں کی اولاد، دروازہ بند کر لیتے ہیں تو رات رات بھر چوکھٹ پر بیٹھا گزار دیتا ہے۔

یہ ایک انور جہاں شیرنی بن کر بھر گئی۔ سب کے سب حیران حیران سے ٹکڑ ٹکڑ دیکھتے رہ گئے۔ قدم پکڑ کر سسکنے والی لونڈیا، آن کی آن میں زحی شیرنی کی طرح دھاڑ رہی تھی۔

کہہ رہی تھی۔ بوٹیاں پچھو اور ہماری۔ مرد اگر کسی کھڑ میں پھینک دو۔ وہ تو اس کی شرافت ہے جو دروازہ بند کر لینے پر بھی رات رات بھر چپ چاپ چوکھٹ پکڑ کر گزار دیتا ہے۔ سن رکھو وہ میرا کوئی ہوتا سوتا نہیں ہے۔ وہ میرا شوہر ہے۔ میں نے عقد کیا ہے اس سے وہ جس وقت چاہے میرا ہاتھ تھام کر اس چار دیواری سے مجھے نکال سکتا ہے، جہاں میرا دم کھٹ رہا ہے۔

طرحدار علی خاں کو جانم کا اس ماحول میں سانس لینا ایک لمحہ نہ بھاتا تھا۔ وہ تو صرت اپنی جانم کی خاطر کھٹی وہ بالی جی کو راضی کر لیں گی تو تمہنی خوشی و دواع ہوں گے۔ اس نیک ساعت کے منتظر تھے جب کہ جانم ان کے

چھوٹے سے گھر میں منتقل ہو جائیں گی جو انھوں نے اپنے ماں باپ کی چوری چھپے کر لئے پرے رکھا تھا۔

لیکن یہ سب کچھ نہ ہو سکا۔ بانی گھاٹ کا پتھر تھیں۔ طوفانوں نے اپنا سر پھوڑ لیا لیکن وہ نہ ملیں۔

طوفانوں نے خود ہی اپنا رخ بدل لیا۔ اور اس طرح رات کے اندھیرے میں انور جہاں جہنم جہنم کے لیے طر حد اعلیٰ خاں کی ہو گئی تھیں۔
اپنی دولت جب اس طرح شہر میں برسر عام لٹنے لگی تو بانی جی کے لیے اپنے بچے ہوئے اثاثے کے لاسے پڑ گئے۔

یہاں کے فواب زادوں کے چنگن بانی جی کو دنیا بھر سے کچھ مختلف ہی نظر آئے۔ جن کے پاس دولت ہوتی وہ بے دریغ لٹا دے بھی۔ لیکن ایسے تھکتے بھی تھیں انگلیوں پر رگن لیا جاسکے۔ دوسرے تھے تو عشق جیسے تھیں دہشت میں ملا تھا۔ کیو پڈ کا دیوتا جیسے ان کے خانہ دل کا پاس بان تھا ایسا شاید عشق کرتے کہ مجنوں بے چارہ اس وقت زندہ ہوتا تو شاید اس کا سارا گیا گرایا مٹی میں مل جاتا۔ اتنے دن کی شہرت، عزت و ناموس دیکھتے دیکھتے جہنم داخل ہو جاتی۔
انور جہاں جب اتنی آسانی سے طر حد اعلیٰ خاں کی ہو رہیں تو دنیا کی ساری محبتوں پر سے بانی جی کا ایمان اٹھ گیا۔ وہ جس کو سینے سے لگا کر سلایا، وہ جس کو پھاتیاں چوا کر دودھ پلایا۔ وہ جس کے لیے زندگی کا سکہ چین لٹا دیا۔ وہ جس کی آنکھ نہ بھپکی تو اپنی راتیں تصدیق کر دیں۔ وہ جس کو۔ وہ جس کو۔ وہ جس کو۔
اور یادوں کا ایک سلسلہ ان کے ذہن سے گزر کر ان کی آنکھوں کے آگے جسم

ہوتا ہوا بس آنسو بن کر آنکھوں سے ڈھل گیا۔

یہ آنسو بانی جی تمہارا مقدر بن سکتے ہیں۔ یہ آنسو بانی جی تمہارا مقدر بن سکتے ہیں۔ کوئی تمہا جو مسلسل بانی جی کے کانوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر چلا رہا تھا۔ یہ آنسو بانی جی تمہارا — تم یہاں سے چلی جاؤ۔ تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔

اپنی بچی کچی دولت لے کر لوٹ جانا چاہیے — اپنی دونوں سیٹیوں کو لیکر واپس ہو جانا چاہیے۔ کوئی ہتھوڑے سے ذہن پر چلا رہا تھا اور بانی جی نے طے کر لیا کہ کئی دن سے یہ جو آ رہے سے دل پر چل رہے ہیں۔ انھیں اپنی گرفت میں مضبوطی سے تھام کر پتھر پر اس طرح پھینکے گی کہ اس شہر کی ہر ماں کا دل گھائل ہو جائے۔

چھوٹی بٹیا کو راجہ صاحب نے آج پھر مجرے کے لیے بلایا تھا۔ بانی جی سُن چکی تھیں کہ وہ چھوٹی بٹیا کے بغیر پل بھر چین سے نہیں گزار سکتے تھے۔ مجرے کا بیٹا لوٹاتے ہوئے بانی جی نے کہا — داروغہ جی راجہ صاحب سے کہہ دینا۔ وہ جو بیچتے تھے وہاں سے دل — وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔

لیکن چھوٹی بٹیا نے بڑھ کر داروغہ جی کو آواز دی — ”کہہ دینا میں رہی ہوں“ بانی جی نے چھوٹی بٹیا کو اس انداز سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہوں — بٹیا تمہارے دل کے کسی کونے میں کہیں تمہاری ماں بھی تو رہتی ہو گی؟ — اسے ڈھونڈ نکالو، اسے ڈھونڈ کر نکالو۔

لیکن چھوٹی بٹیا نے بانی جی کو نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں۔

چھوٹی بٹیا جانے کی تیاری کرنے لگی تو — بانی جی نے سوچا —
 دھڑا دھڑا اپنا گھر چلتا رہے تو قہقہہ لگانے میں کتنا مزہ آتا ہوگا۔
 لیکن اس سے پہلے کہ وہ قہقہہ مار کر ہنس سکتیں کسی نے ان کے قدم کپڑے۔
 بانی جی جلتے ہوئے گھر کا سماں آنکھیں میں لیے خیالوں ہی خیالوں میں
 کہیں دو درہا چکی تھیں۔ پتہ تک نہ چلا کہ کون درہا آیا اور کس نے قدم تھام لیے۔
 انور جہاں کی سرکشی کے خلاف بانی جی نے اپنے ترکش کا کوئی تیرا کھٹا
 نہ رکھا تھا جو سر نہ نش نہ کر سکے۔

لیکن جب بارہ ہونی ہے تو بانی جی جیسے اس طرح لٹ لٹا گئیں کہ غصہ
 کرنے کی جرات بھی ان سے کسی نے پھین لی۔ اور اب بٹیا پر پڑے نکالنے
 لگی تھی تو بانی جی میں ہمت ہی نہ تھی کہ قہقہے لے کر بال و پیر کتر دیتیں۔
 اب تو کوئی انہیں کی غنچاوری کرے تو کرے۔ کوئی انہیں پر ترس کھائے تو کھائے۔
 بانی جی نے تڑپ کر جو گردن جھکائی تو انور جہاں قدموں میں سسک رہی تھی۔
 ”ماں۔ میں آگئی ہوں۔“
 ”ماں۔ میں آگئی ہوں۔“

بانی جی دیوانوں کی طرح انور جہاں کو گنتی رہیں۔ بدقت انھوں نے پوچھا۔
 ”طرح دریاں کہاں ہیں انور؟“

”میں کچھ نہیں جانتی ماں، مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں ان کا انتظار کرتی
 رہی۔ میں ان کا انتظار زندگی بھر کر سکتی تھی۔ مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ
 وہ لٹے ہوئے جاگیر دار ہیں۔ وہ چاہتے کچھ ہوں ماں، میرے پیٹ میں میرے

لیٹ میں۔ اور انہیں اس سے بھی تو محبت نہ ہو سکی۔ جوان کا بھی۔۔۔ جوان کا بھی خون ہے۔

بائی بچی نے انور کو اکٹھا کر سینے سے لگالیا۔

”میں کہیں نہیں جاؤں گی بیٹی۔ میں اب کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں اس شہر سے چلی جانا چاہتی تھی۔ لیکن میری حیرت ہو گئی ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ اس دنیا میں کوئی چیز سچی نہیں ہے۔ صرف آنسو سچے ہیں۔ وہ چراغ نہیں بجھتے جو بھگی ہوئی آنکھوں میں جلتے ہیں۔ اور طرح دار میاں کے کہیں چراغوں نے تیری زندگی میں روشنی ہی روشنی بھری تھی۔ ایسی روشنی جس کے آگے میرے گناہ کا نپ کانپ جاتے تھے لیکن وہ سارے چراغ بجھ گئے ہیں۔“

انور نے نظر اٹھائی تو اسے کھونٹی پر اپنی جاننا زادہ تسبیح نظر آئی جن کا طرح دار میاں کی ہو رہنے کے بعد اس نے سہارا لیا تھا۔

اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ماں جھاڑ پونچھ کر کہیں کسی مسجد میں بھجوا دو۔“

اور بڑے انداز سے بڑھ کر اس نے فرش پر پڑے ہوئے پائل اٹھالیا۔

ساحی

میں نے جب ان کا خط کھولا تو کتاب کی پنکھڑیاں میرے قدموں میں گھومتیں۔
اور یہ پنکھڑیاں ساحرہ نے بین لیں۔

میرا کتنا جی چاہا کہ بھوک کر ایک ایک پنکھڑی چن لوں۔ لیکن یہ مجھ سے نہ ہوا۔
شرم دامن گیر تھی۔ میں نے ان کا خط لکھی تو نہیں پڑھا بس القاب پر نظر ڈال کر
یہی سرخ ہوا کھٹی اور اپنے بلوز میں اس کو پلو برابر کر لیا۔

پنکھڑیاں چن کر ساحرہ نے مجھے دینی نہیں بلکہ نہایت ہی احتیاط سے انھیں
پلو میں باندھ لیا۔ مجھے یہ حرکت کچھ اچھی نہیں لگی۔ میں تو سمجھی ہوئی تھی کہ
وہ چپکے سے میرے ہاتھ پر رکھ دے گی اور میں مٹھی میں دنیا بھر کی نظروں سے ان
پنکھڑیوں کو چھپا لوں گی یہاں تک کہ ساحرہ کی نظروں سے بچی۔

قد وانی کا جٹ کے کج کج میں لوگ موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے میں نے موتیوں کی مثال اس لیے دی ہے کہ سب کے سب سفید لباس میں ملبوس تھے۔ اور اس لیے بھی کہ ہم گیسٹ میں داخل ہونے کے بعد موٹروں کی پارکنگ کے حصے سے نشیب پٹن میں جانا چاہیں تو ہمیں ان سیڑھیوں سے ہو کر گزرنی پڑتا ہے جو بلندی سے دو شاخوں میں بھینسی شکل میں بدل گئی ہیں، اور نشیب چمن میں پھر مل گئی ہیں ہم سبھوں نے موٹروں سے اترتے ہی انھیں سیڑھیوں کا رخ کیا تھا۔ میں اپنی مرضی سے سبکے پیچھے رہ گئی اور بلند یوں پر کھڑے کھڑے اس خوبصورت سے اجلے اجلے سفید سفید قافلے کا نظارہ کیا جو ان بھینسی سیڑھیوں پر موتی کی مالا بن گیا تھا۔ اور یہ مالا نشیب میں پہنچ کر ڈوٹ رہی تھی اور اس کے موتی دانہ دانہ ہو کر بکھر رہے تھے۔ علیم نے مڑ مڑ کر کسی بار مجھ دیکھنے کی کوشش بھی کی لیکن میں ان کی نظروں سے چھپ کر انھیں دیکھ رہی تھی۔

دو آنکھیں بھری پوری محفل میں کسی کو تلاش کر رہی ہوں، مضطرب بے قرار، بے کل لیکن پچھے چوری — اور وہ دو آنکھیں جن کی تلاش ہو رہی ہے۔ چمن کے کسی محفوظ گوشے میں پھولوں کے بیچ چھپ کر ان پیاسی آنکھوں کی بے قراری کا منظر دیکھ رہی ہوں جو متلاشی ہیں — تو دل دنیا بھر کی کتنی ہی دلتیں پالیتا ہے۔

اور میں انہی دلتوں سے مالا مال ہوتی —

علیم کی نظروں سے چھپ کر علیم کو دیکھتے رہنے میں میرے لیے کیا کچھ نہ تھا میری اپنی آنکھوں کے لیے ٹھنڈک بھی تھی۔ علیم کی عزائی آنکھوں کی بے قراری کا سماں بکھڑا تھا۔

اور علیم نے میری اسی آنکھ چوٹی سے تنگ آ کر مجھے یہ خط لکھا تھا جو اس نے ساحرہ کے ہاتھ مجھے بکھجوا یا تھا۔

اور میں کسی محفوظ کج کی تلاش میں غم رہی تھی تاکہ سب کی نظروں سے چھپ کر علیم کے خط کے لفظوں کو اپنی آنکھوں میں اتار لوں۔

مجھے پھر بکھری ہوئی پنکھڑیوں کا خیال آیا جو ساحرہ نے چن لی تھیں۔
اور میں پھولوں کے اس جھنڈ کی طرف چل پڑی جہاں رنگ برنگے پھول
سکرا رہے تھے۔ پھولوں کے جھنڈ کی اس اوٹ نے مجھے پناہ دی میں نے خط
کھولا۔ علیم نے لکھا تھا۔

دردی..... میری زندگی

میں نے چن میں قدم رکھتے ہی تمہارے لیے یہ پھول کسی کو مل سکی
ایک شاخ سے جدا کر لیا تھا کہ اسے تمہاری زلفوں کی لمبی سیاہ
رات کا چمک دار ستارہ بنادوں۔ لیکن تم تک میری رسائی کہاں
جب کہ تم خود مجھ سے گھپتی رہی ہو۔

اس پھول کے مقدر میں تو پنکھڑی پنکھڑی ہو جانا تھا۔ سو
میں نے بے دردی سے اسے فوج دیا ہے۔ اب تم اتنا ہی کرد
کہ ان پنکھڑیوں کو بکھرنے نہ دو۔

تمہارا علیم

اور پنکھڑیاں نہ صرف یہ کہ کھری تھیں بلکہ ساحرہ کے ہاتھوں نے انہیں میرے قدموں
میں سے چن لیا تھا۔ میں تڑپ کر رہ گئی۔ میں نے خط پڑھا۔ اور میری

زلفوں کی لمبی سیاہ رات بغیر کسی تارے کے ویران سی رہ گئی۔

جب میں پھولوں کے جھنڈے سے نکل کر سب میں آئی تو۔ علیم نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے نظروں ہی نظروں میں پیار کر رہے ہوں۔ تماش کھیلنے ہوئے ان کی نظریں تماش پر نہیں تھکتیں۔

لیکن اب میرے دل و دماغ پر علیم نہیں ساحرہ چھاپ چکی تھی میری نظریں اس کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ کہیں نہیں تھی۔

یہ ایک وہ مجھے نظر آئی۔ علیم ہی کے پیچھے بیٹھی ہوئی اٹھیں کارڈس ڈس کارڈ کرنے میں مدد دے رہی تھی۔

ساحرہ علیم سے کس درجہ گھل مل گئی ہے۔ وہ تو میرے اور علیم کے درمیان ایک ایسا ربط باہمی تھی جو زنجیر کی ایک کڑی کو دوسری سے ملاتی ہے۔ لیکن جب یہ زنجیر ٹوٹ جاتی ہے تو اس کی کڑیاں اٹھیں جو گردوں میں سے جدا ہو جاتی ہیں۔ جو ان کے ملاپ کا وسیلہ تھیں۔

میں صرت اتنی سی بات پر ساحرہ کی مخالفت میں اتنا بہت کچھ کیوں سوچ رہی تھی۔

شاید میرے اندر چھپی ہوئی وہ عورت بیدار ہو رہی ہو جو زندگی کا دانا لگا کر بھی اپنی محبت کی ایک ایک کرن کا حساب دنا چاہتی ہو اور علیم تو خاندان بھر میں چٹکی ہوئی دھوپ تھے۔ سب کے جیسے۔ لیکن یہ سورج تو میرا ہی تھا نا۔ بلا شکر ت غیرے میرا۔ میں کچھ ایسا ہی سمجھ بیٹھی تھی۔

پتہ پھینک دو بھی۔ ساحرہ کی آواز نے مجھے اور علیم کو بیک وقت چونکایا۔

اور علیم نے بھٹ سے پتہ پھینکنا چاہا تو ساحرہ نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔
 ”کیا کر رہے ہو۔ تمہیں ڈھنگ کا پتہ پھینکنا بھی نہیں آتا۔“ علیم کے
 ہاتھ میں ادھر کھلے گول پنکھے کی طرح سجے ہوئے کارڈس میں سے جو پتہ آگے نکل
 آیا تھا۔ اس کو ساحرہ نے پھر سے برابر کر دیا۔ اور بڑے ہی خشک انداز
 سے کہا۔ یہ پتہ پھینک دو۔

اور علیم نے چپکے سے وہی پتہ پھینک دیا۔
 مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ساحرہ نے مجھے ڈس کارڈ کر دیا ہے۔
 اور اس کے بعد علیم نے میری طرف کم دیکھا اور میں اپنی یہ توہین گوارا نہ
 کر سکی۔ اور چپکے سے اٹھ کر تاش کی اس محفل سے چلی آئی۔ اس وقت
 شاید میں علیم کے ذہن سے اس طرح محو ہو گئی تھی۔ جیسے ڈس کارڈ کیا ہوا پستہ
 کھلاڑی کے ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔

میں جب اٹھ کر جانے لگی تو ساحرہ نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ایسی نظروں
 سے جو کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ لیکن کہہ جانا ان کے بس میں نہ ہو۔
 میں کسی گوشے میں چھپ چھپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی۔ لیکن
 گوشے میں پہنچ کر بھی میرے آنسو نہ نکلے۔

وہ ہارٹ کی بیگم۔ علیم نے ڈس کارڈ کی ہے۔ وہ تو تم۔ وہ تو تم ہو۔
 وہ تم ہو۔

”میں نہیں ہوں۔ میں نہیں ہو۔ میں نہیں ہوں۔“ میری زبان
 سے بہت آہستہ سے یہ الفاظ نکلے۔

اور دوسرا سو میرے گالوں تک ڈھلک آئے۔
 ”یہ کیا ہے۔۔۔ بگلی۔۔۔“ میں نے اپنی آنکھوں پر نرم ہاتھوں کا لمس
 محسوس کیا۔

یہ ہاتھ ساحرہ کے تھے۔۔۔ میں تڑپ کر رہ گئی۔
 ”خدا را مجھے تنہا چھوڑ دو ساجھی“
 ”لیکن تم وہاں سے اس طرح اٹھ کر کیوں چلی آئیں؟“
 ”تمہیں اس سے کیا مطلب؟“

”بہت ہو چکی جو اس۔۔۔ چلو میرے ساتھ۔۔۔ میں نے جو کچھ کیا ٹھیک ہی
 کیا ہے۔۔۔“

ساحرہ لمحے بھر کے لیے رکی۔ پھر کہنے لگی۔ ”تمہیں پتہ ہے ساری نظریں تم
 دو ذوں ہی کو تک رہی ہیں۔۔۔ تم لوگ اس طرح ہوش کیوں کھو دیتے ہو اپنے
 قریب آتے ہو تو سلیقے سے ایک دوسرے سے بات تک نہیں کر پاتے سٹی گم
 ہو جاتی بنے بس۔۔۔ ایسے جیسے تخت نہیں کر رہے ہو۔۔۔ زندگی سے ڈر رہے
 ہو۔۔۔ جذبے اور احساس سے ڈر رہے ہو۔“

میں بیسے ہوش میں آنے لگی۔ میرے اور علیم کے دل و دماغ اور نطق و لب
 کی دسے داریاں کھلی جب ہماری سوتی جاگتی آنکھوں پر پردے ڈالتی پھرتی ہے۔
 لیکن اس پردہ داری سے اسے کیا مل جاتا ہے؟ ۱۹۔

اس کے اصرار پر میں پھر سب لوگوں میں آئی۔
 تاش کی محفل جو پرخواست کر دینے میں علیم پیش پیش تھے طے یہ ہوا کہ آنکھ جو بولی

کھیلی جائے لیکن ہم لڑکیوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔

علیم نے مجھ سے آنکھوں میں آنکھوں میں انتہائی کہ میں مدافعتی ہو جاؤں اور میں نے نہ صرف آمادگی ظاہر کر دی بلکہ دوسری سہیلیوں کو بھی ہموار کر لیا۔ کھیل شروع ہوا تو میں اس پھولوں کے جھنڈ کی طرف بھاگی جستقل طور پر میری جائے پناہ تھی۔ میں نے جھنڈ کے پیچھے خود کو چھپایا اور خرم گوش کی طرح دیک گئی۔ ساری لڑکیاں اور لڑکے قدوائی کالج کے کیمج کیمج میں پھینتے پھر رہے تھے مجھے شک گزرا کہ اس لڑکی نے مجھے پھولوں کے جھنڈ میں پھپھتا ہوا دیکھ لیا ہے تو چور بنی تھی۔ میں اس ادھیڑ بن میں تھی کہ یہاں سے کہیں اور جا پھپھوں گی کہ پیچھے سے کسی نے مجھے دبوچ لیا۔ میرے پیچ نکلتی نکلتی رہ گئی۔ میں سمجھ گئی کہ میں چور بن گئی ہوں۔ لیکن مجھے تو ایک ایسے چور نے دبوچ لیا تھا جس نے مجھ سے میرا سب کچھ چرا لیا تھا اور اس اداسے کہ میں لٹ لٹ کر سکر رہی تھی۔ راتوں کی نیند اس نے چرائی تھی۔ دن کا سکھ اس نے چرا لیا تھا۔ اور اب اس پھولوں کے جھنڈ میں آ پونچا تھا کہ قدوائی کالج میں میرا یہ گوشہ عافیت کبھی چرائے جو مجھے ساری دنیا کی نظروں سے چھپا کر اس کی بے چین نظروں کا نظارہ کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ ہش۔ اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور مجھ سے ہر گوشوں میں کہنے لگا۔ بس زندگی بھر ہم دونوں یہیں چھپے رہیں گے۔

میں علیم سے اس قدر قریبے احساس ہی سے سلگ اٹھتی تھی اور اب جب کہ اٹھوں نے مجھے اپنی باہوں میں لے رکھا تھا تو میرا جسم جیسے جل رہا تھا۔ میری ساری ہستی آتش تھی ہو رہی تھی میری نس نس میں ایک آتش سیال رواں تھی۔ میری کن پیٹیاں

پھر ک رہی تھیں۔ میرے دل کی دھڑکن جیسے خود تجھے سنائی دے رہی تھی۔
 پھر علیم کے ہونٹوں کا لمس میں نے اپنی گردن پر محسوس کیا۔ میں تڑپ کر ان
 باہوں سے نکل جانا چاہتی تھی، جن باہوں کے حلقے میں محصور ہو کر ساری زندگی گزار
 دینے کا مجھے ارمان تھا۔ میں نے کوشش کی لیکن باہوں کی زنجیر نے مجھے کس کر
 رکھ لیا۔

اور ہم دونوں اسی عالم سرشاری میں اس چور کو بھول بیٹھے تھے جو قسمت کی طرح ہمارا
 تعاقب کر رہا تھا۔ کد کسی نے قریب ہی سے کہا۔ ”کوئی آ رہا ہے۔ کوئی آ رہا ہے۔“
 علیم مجھے بھوڑ کر الگ ہو گئے۔ میرے گالوں میں اڑنے والا خون جیسے سرخی رخصت
 بن کر منجمد ہو گیا۔ ایک ایسے خوف نے ہماری محبتوں پر پھوپھوپ کر پیچھے سے دار کیا
 تھا جو خود ہماری محبتوں ہی کا پردہ درہ تھا۔ میں پسینے میں نہا نہا کر رہ گئی۔ یہ
 کیسا لمحہ تھا۔ کیسی گھڑی تھی۔ یہ کیسا پل تھا جو بیکلی بن کر ہم پر گر گیا تھا۔
 یہ کون ہے جو ہمیں دوسروں کی آمد کا احساس دلانا رہا ہے۔ میں تو اس سے
 بھی مخالف تھی جو میرے اس راز سے واقف ہو کر مجھے دنیا کی نظروں سے بچا لینے کے لیے
 اپنے تعادن کی پیش کش کر رہا تھا۔

تم کہیں اور چلی جاؤ راجی۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو؟ اور میں نے آواز
 پہچان لی۔ یہ سا جو تھی۔ میری اپنی راجی۔ علیم کے اور میرے درمیان
 جو ایک رابطہ تھا۔ ایک واسطہ۔ ایک وسیلہ۔ زنجیر کی کڑیوں کا وہ جوڑ جو
 ایک کڑی کو دوسری سے ملاتا ہے۔

”تم لوگوں نے کوئی اچھی حرکت نہیں کی۔“ وہ پھر کہنے لگی۔ اور علیم نے

اسے بڑی ناگواری سے دیکھا لیکن ساحر نے عظیم کی ان نظروں کی بالکل پروا نہیں کی۔
 اس کا اس طرح ہمارا تعاقب کرنا مجھے بڑا ناگوار محسوس ہوا۔ وہ آخر کون
 ہوتی ہے ہمارا سایہ بن گئی ہے اس کی اس دوستی کتنے پچھے آؤ کون سا جذبہ ہم
 کر رہا ہے۔ مجھے تو اس پر کچھ شک سا ہونے لگا اور یہ شک اس وقت یقین
 سے بدل گیا۔ حجب میں نے دیکھا کہ ہماری طرف کوئی بھی نہیں آ رہا تھا۔ ساحر
 نے ہماری ایک جاتی سے جل کر صرخت ہمیں جدا کر دینے کے لیے ہمیں کسی کی آمد
 سے ڈرایا تھا۔ اور میں اس لیے ڈر گئی تھی کہ ایسے میں حجب کہ دو دل مل بیٹھ
 ہوں، کوئی آدمی آتا ہے تو وہ اکیلا نہیں ہوتا ہے۔ تنہا نہیں ہوتا، ایک دنیا
 اس کے ساتھ ہوتی ہے، ایک زمانہ اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن یہاں
 تو کوئی نہیں تھا۔

عظیم بڑھ کر دوسری طرف جانے لگے تو ذکیہ نے جو اس وقت چور تھی عظیم کا
 تعاقب کیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ عظیم کو جا لیتی، کوئی دوسرا ہی اس کے ہاتھ
 لگ گیا۔ وہ راہی تھی جو پاس ہی پیر طر کے پیچھے چھپن ہوئی تھی۔ اور ذکیہ
 راہی سے چھپتی ہوئی چلا رہی تھی۔

”راہی چور راہی چور۔۔۔ سا حقو باہر آ جاؤ۔۔۔ راہی پکڑ لی گئی۔“
 رکے سب پیچھے ہوئے گوشوں سے کچھ اس طرح نکل آئے کہ دوسرا یہ بھی نہ
 جان سکا کہ کون کہاں چھپا تھا۔

میں بھی اٹھی تو ساحر نے میری ہانہ پکڑ کر کہا۔۔۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے روتی
 ۔۔۔ غلط نہ ہو۔۔۔ کوئی دیکھ لیتا تو۔۔۔ اور پھر۔۔۔ اور پھر۔۔۔ اتنا

قرب بھی تو اچھا نہیں۔

میں نے تنک کو بانہ پھڑائی۔ اور اپنی دوسری ہتھیلیوں میں بھاگ آئی۔
اس کے بعد میں نے خود کو چور سے زیادہ علیم سے پھپھائے رکھنے کے
جتن کیے۔

آنکھ پھولی جا رہی ہے۔

میں نے دیکھا ساھی علیم سے کچھ ایسی باتیں کر رہی تھی جس کا علیم برا مان رہا
تھے اور یہ باتیں یقیناً ہم دونوں کی یک جہتی کی مخالفت میں ہوں گی۔ میں نے
سوچا علیم سے صاف صاف کہہ دوں کہ اب تمھارے خط کے ایک ایک لفظ
کے لیے مجھے برس برس بھر ترسنا گوارا ہے لیکن یہ گوارا نہیں ہے کہ کوئی تمھارا اور
میرا سایہ بن جائے۔ اور واقعی مجھے ساھی سے دشت سی ہونے لگی تھی۔

لیج کا وقت آیا اور ہمیں اطلاع دی گئی تو ہم سب اکٹھے ہونے لگے۔

علیم بھری محفل میں مجھ سے بات کرتے ہوئے یوں عجیب اجتناب کرتے۔ لیکن
بعض ڈشز واقعی اتنی اچھی تھیں کہ انھوں نے بڑھ کر خود میری تواضع کی اور دو ایک
بار اپنی پلیٹ سے میری پلیٹ چپکے سے کچھ چیزیں منتقل کر دیں۔ بٹھے تھا اور
یہ مواقع ہمیں آسانی سے فراہم ہو سکتے تھے۔ جو ہوئے بھی۔

اس نعمت کے باوجود بھی جو مجھے حاملِ حق ہیں اس طرح چلنے لگی تھی جیسے کوئی
چور سارا اثاثہ بٹور کر واپس جاتے ہوئے صاحبِ خانہ کے قریب سے بنوں کے بل
چلتا ہو۔ اس دروازے کی طرف جس دروازے کو اس نے اپنی دایمائی کے لیے
کھول رکھا ہو۔

لیکن ساحرہ تو علیم کی بھیجی ہوئی دولت کے کر میرے خانہ دل میں آئی تھی۔ اور جب یہ دولت میں نے سوچتے سے چھپا کر رکھ لی تو وہ چوروں کی طرح بڑھ کر بچوں کے بل واپس جا رہی تھی اور وہی دردناک اس نے واپسی کے لیے کھلا چھوڑ رکھا تھا جس سے وہ داخل ہوئی تھی۔

لیکن پرنچ پر وہ موجود نہیں تھی۔ میں نے کتنا اسے تلاش کیا۔ اپنی ہجولیوں درسیلیوں سے پوچھا۔ سب حیران تھے۔ وہ یکا یک کہاں چلی گئی۔ کیوں چلی گئی اس کے سوا اور کوئی سلیلی موجود نہ ہوتی تو یہ خیال بھی ہو سکتا تھا کہ کہیں گھوم پھوہ رہی ہوں گی۔

مجھ رانی نے چپکے سے بتایا۔ کہ اس نے ساحی کو ادب پر چڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ آبدیدہ تھی۔

میں نے کہا چلی تو ذرا ادب دیکھ آئیں۔ اس کا اسکوڑ ہے یا نہیں۔ بیفوری سیڑھیوں سے گزر کر ہم ادب پر پہنچے تو اس مقام پر جہاں موڑ میں پارک کی گئیں تھیں۔ ساحی کی ”وسپا“ نہیں تھی۔

ہمیں اس کی واپسی کا یقین ہو گیا اور ہم نشین چمن میں لوٹ گئے۔ لیکن یہ بات کہ وہ آبدیدہ تھی۔ نہ ہر کا بوکر بوکر بن کر میرے ذہن پر گر رہی تھی۔

رانی جیسے مجھ سے درد کھڑی ہوئی کہہ رہی ہو۔

”وہ آبدیدہ تھی۔“

پھر جیسے قریب آکر اس نے کہا۔

”وہ آبدیدہ تھی۔“

میں نے پھر بھی نہیں سنا تو۔۔۔ اس نے جیسے میرے کان میں کہہ دیا تھا۔

”وہ آبدیدہ تھی۔“

لہجہ ختم ہوتے ہوتے وہ لوٹ آئی۔

رابی نے بڑے چاؤ سے کھانا اس کے لیے میز پر چن دیا جو اس نے بڑے ہی اہتمام اور احتیاط سے ساجی کے لیے محفوظ کر رکھا تھا۔

رابی کی اس حرکت نے ہماری دوسری سہیلیوں کے ساتھ تجھے بھی کچھ دیے کیسی اچھی حرکت کی رابی نے۔ دوستی کی محبت کی۔ ایسی حرکت جو چپکے سے دل میں دور دور تک اپنے لیے راستہ بنا لیتی ہے اور پتہ تک نہیں چلتا۔ ساجی کے لیے یہی سب کچھ تو تجھے کرنا چاہیے تھا۔

میں نے دیکھ لیا تھا آبدیدہ تھی۔۔۔ اور میں یہ جان کر اس لیے خوش ہو گئی تھی کہ اس کی آنکھوں کی یہ منی۔ اس کی پلکوں کا یہ بھینگا پن (اسی دوستی کے ضمن میں تھا جو تجھ سے اور علیم سے دو بیک وقت نبھا رہی تھی۔ اس دوستی کے ضمن میں تھا جو کبھی کبھی میرے ذہن میں اپنا روپ بدل کر ابھرنے لگی تھی۔ لیکن میں قطعی طور پر یہ تصفیہ نہ کر پائی تھی کہ ساجی کی دوستی اور دشمنی میں کتنا فضل ہے۔ اب جو وہ چپ چاپ اپنے کھانے پھکی ہوئی تھی۔ تو اس کی اس بے بسی پر نہ جانے کیوں مجھے سکون سا مل رہا تھا۔

میں ایسے جذبے اپنے دل و دماغ میں ساجی کے لیے پروش رہا کرتی تھی لیکن محبت کے

پیدا کر دکھی نہیں ہوتے۔

اور یہ سارا انقلاب مجھ میں کج ہی پیدا ہوا تھا۔

اسی قدوائی کالج میں جس کے گیٹ میں داخل ہونے کے بعد موٹروں کی پائونگ کے حصے سے نشیب چمن میں جانا چاہیں تو ہمیں ان سیرٹھیوں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ جو بلند ری سے ان شاخوں میں بیضوی شکل میں بٹ گئی ہیں۔ اور نشیب چمن میں پھر مل گئی ہیں۔ اس قدوائی کالج میں جہاں سیرٹھیوں سے اترتے ہوئے میں اپنی مرضی سے سب سے پیچھے رہ گئی تھی اور بلند ریوں پر کھڑے کھڑے اس خوبصورت سے ابلے ابلے سفید سفید قافلے کا نظارہ کیا تھا۔ جو ان بیضوی سیرٹھیوں پر موتیوں کی مالابین کیا تھا۔ اور یہ مالابین میں پورے کچ کر ڈوٹ رہی تھی اور اس کے موتی دانہ دانہ ہو کر کچھ رہے تھے۔

اور اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہ کچھ سے ہوئے موتی اگر مالاکاروپ دھار لیں بھی تو وہ موتی اس میں نہ پر دئے جا سکیں گے جو میری اپنی نظر میں سب سے زیادہ تاب دار تھے۔

اور وہ موتی تھے عظیم میں اور ساجی۔

ساجی کھانا کھا چکی تھی اور سبز سے اٹھی تو میں بھی اس کی اداسی سے سکون پا کر خیالات کی دنیا میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھی۔ قدوائی کالج میں اس طرح لوٹ آئی جیسے مجھے ادین لٹے میں اپنے تجرب کی اماں پانا نہیں ہے بلکہ کسی چپے ہوئے دشمن کے مضبوط بازوؤں کے بھر پور وار سے بچ نکلتا ہے۔

اور میں اپنے انہی تصورات کے ساتھ جیسے ساجی کے مقابل ہو گئی۔

لیج کے بعد نوڑھوں نے سستانے کا پردہ گرام بنا لیا۔ اس سستانے میں نیم دراز ہو کر قیلوہ کرنے سے لے کر پان دان کھول کر گلوہریاں بنانے، پھر گلوہریاں منھ میں رکھے جگالی کرنے تک کے سارے مشاغل شامل تھے۔ میلوں ٹھیلوں میں، تفریحوں میں جب کہ زندگی ذرا تیز کام ہو جاتی ہے بڑے بوڑھوں کا گھنے پیڑوں کے ٹھنڈے سایوں میں ذرا کی ذرا پل بھر کو سستا لینا، میچلے نو جوانوں کے لیے لمحہ فکریہ بھی ہوتا ہے اور لمحہ نشاطِ حیا بھی۔

ایک تو ایسا لگتا ہے جیسے بزرگوں نے جن کی عقابی آنکھیں جن میں جھومتے ہوئے پھولوں پر نظر رکھتی ہیں۔ ان کی اڑتی ہوئی خوشبو پر نظر رکھتی ہیں۔ ٹھک ہا کر کہیں بیٹھ رہی ہیں تاکہ ”آگے چلیں گے دم لے کر۔“ اور ان لمحاتِ نزہت میں پھول زیادہ جھوم لیتے ہیں۔ خوشبو ہر نفس کے لیے شمیمِ جان بن جاتی ہے۔

لیج کے بعد ہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ لیج کے بعد قدوائی کا جٹ میں ایک دنیا اونٹنوں کی سی تھی، ایک دنیا نئی ترنگوں کے ساتھ کسماکسم بیدار ہو رہی تھی۔ بیدار ہوتی ہوئی دنیا نے اپنے پر توے۔ چلو چلتے ہیں۔ ذرا ادھر ادھر گھوم آئیں۔ شام ہوتے ہوتے تو واپسی ہوگی۔ گھومنے پھرنے کا اب یہی تو ایک موقع ہے۔

بات دینی زبان سے نکلی تھی جو لغزہ بن کر زبان زد ہو گئی۔ اور جیسے اس لغزہ بازی سے بوڑھے چونک اٹھے۔

نہیں کبھی لیج کے بعد یہ گھومنا پھرنا کہاں کی دانش مندی ہے لیج کے بعد تو سستانا چاہیے۔ کچھ تاش چلنے دو بیٹھے بیٹھے یہیں پر۔“

ہم نے ایسا کون سا ٹکڑا بیچ کیا ہے۔۔۔ یہی جتنا آپ لوگ ناشتہ کرتے ہیں۔
 سب مہنس پڑے، بزرگ بھی فوجوان بھی۔۔۔ سبھوں نے پلٹ کر دیکھا۔ ساجی
 یہ جملہ کہہ کر ایسی چپ چاپ کھڑی تھی جیسے ضرورتاً بھی مسکرا کر انا بول گئی ہو۔

ہم گھومنے پھرنے کے لیے نکل پڑے۔۔۔ ذرا فی کالج کے احاطے سے باہر
 نکلنے وقت گیٹ کی اوٹ سے کسی نے میری بائیںہ بکڑائی میں ذرا رنگ گئی تو علیم
 نے مجھے تڑپ کر اس طرح دیکھا جیسے نہ رنگی بھر ایک لمحے کی مجھ سے بھاری بھی وہ
 سہمہ نہ سکیں گے۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں انھیں قلمی دی کہ بس اب ان تک
 پہنچتی ہوں۔۔۔ لیکن گیٹ کی اوٹ میں پھٹی ہوئی ساجی پر نظر پڑتے ہی علیم
 بکھٹ ہوا ہے پاس بھاگ آئے۔ ایسے جیسے ہم دونوں کی پاک جانی سے ڈرتے ہوئے
 ہم دونوں کا سر ایک دوسرے سے جوڑ کر آہستہ سے ٹکرایا۔۔۔ پھر بڑے
 چارے ساجی کے دونوں ہاتھ علیم نے اپنے دونوں ہاتھوں میں تمام لیے۔۔۔
 انھیں بڑی نرمی سے دبایا۔۔۔ پھر گال سملائے۔۔۔ بگنی انیس کی۔۔۔ اس قدر
 برامان جاتی ہے۔۔۔

ساجی میرا ہاتھ چھوڑ کر آگے بڑھ گئی تو علیم پیچھے رہ گئے۔ لیکن اس منٹ
 بھر میں میرا یہ حال ہو گیا تھا۔ جیسے سر باز اس آدمی نے میرے منہ پر پھونک دیا
 ہو۔ جس کو میں چاہت کی نظروں سے تک رہی تھی۔ میں بھلا ساجی پر ترس کھانے
 چلی تھی۔۔۔ اس ساجی پر جس نے مجھے اپنے برابر کھڑے نہ رہنے کے قابل بھی
 نہ رکھا۔

علیم کی اس حرکت نے مجھے جیسے بلندی سے گرا دیا تھا۔ ایسی بلندی سے جس پر

علیم خود میرا ہاتھ تھام کر لے گئے تھے۔

ساحی مجھ سے کہنا چاہتی تھی۔۔۔ بڑی لطافت سے اتنی لطافت سے کہ شاید وہ میرے پیر بھی تھام لیتی۔۔۔ شاید شاید وہ علیم کو مجھ سے مانگ لینا چاہتی تھی۔۔۔ لیکن جب خود دوڑ کر اس کے آگے جھک گئے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ساحی نے میری غلط فہمیوں کے منہ پر ایک طمانچہ مارا ہے منٹ بھر میں، پھر ایک بار ساری بساط الٹ چکی تھی۔۔۔ میں سوچ رہی تھی کہ علیم میرے ہیں یا ساحی کے۔۔۔ دست سوال مجھے دراز کرنا پڑے گا یا ساحی کو۔۔۔ میں تو، جب ساحی ابیدہ ہو کر اس انجن سے فرار ہوئی تھی یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ میں ساحی پر جب چاہے مکر اسکتی ہوں۔ جب چاہے مکر اسکتی ہوں۔

لیکن اب خود میرا یہ حال ہو گیا تھا کہ ساحی تو کیا ہر شخص مجھ پر ترس کھا سکتا تھا۔

ساحی نے اپنے قدم تیز کر دیے تھے۔

میں پیچھے رہ گئی تھی۔

وہ شاید سچوں میں بجا تھی تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

علیم اس طرح گم سم تھے۔ جیسے ہمارے جیت کا نقشہ جہاں سبہ ہوں۔۔۔ میں نے بھی ان کو نظر انداز کر دیا۔۔۔ میرے اندر کی عورت پھر بیدار ہو گئی تھی۔ وہ عورت جو مرد کے قدموں تک جھلکنا گوارا کرے۔ یہ بھی تو عورت کے آگے سر خم کرنا کبھی بھی گوارا نہیں کر سکتی۔ اور پھر ایسی صورت میں جب کہ اس کی محبت چھپنی بھاری ہو۔

میرا پتہ داد اب اس عورت کا پسندار تھا جس کی دوسری عورت نے محبت

چھین کر ہی زخمی نہیں کیا تھا بلکہ جس کا محبوب خود بڑی امانت سے اس کا ہاتھ
چھانک کر اس عورت کی طرف بڑھ گیا تھا۔ جس نے محبت چھپی نہ تھی۔
رومی ٹھہر جاؤ۔

پیچھے سے علیم نے مجھے اس طرح پکارا جیسے ان کی آواز میں دنیا بھر کا
دکھ درد سمیٹ آیا ہو۔

ساتی مجھے اور علیم کو پیچھے چھوڑ کر شاید بھوں میں جا ملی تھی۔
میں بھی چاہتی تھی کہ علیم کو پیچھے چھوڑ دوں۔
لیکن ساتی سے آگے نکل جاؤں ایسی کوئی بات میرے بس میں نہ تھی۔
پھر بھی میں نے اپنے قدم اور تیز کر لیے۔

علیم نے بالکل اس طرح پکارا جیسے پیہ پانی کہاں، پکارتا ہے۔
میں نے بارہا پیسے کی آواز کو اس طرح بھی محسوس کیا ہے۔ جیسے یہ آواز
اپنے دل سے پیدا ہو رہی ہے، میری اپنی زبان سے نکل رہی ہو اور میرے اپنے
ہی کانوں میں وودھی وود ٹپکا رہی ہو۔

لیکن آج میں نے علیم کی اس آواز کو سنی ان سنی کر دیا تھا۔ بالکل ایسے جیسے
اس آواز کی لذتوں سے میں آشنا ہی نہیں ہوں۔

ساتھیوں کی ٹوٹی مسلسل نشیب و فراز سے ہو کر گز رہی تھی۔ میری سکر
گھنے درختوں کا ایک سلسلہ سادہ رنگ شروع ہو رہا تھا اور یہ ٹوٹی اس سلسلے
کے پچوں بیچ چوکی چکی تھی۔ جب کہ میری کے یہ سائے میرے قدموں کے نیچے
ابھی ابھی جھکے تھے۔ علیم ابھی دھوپ ہی میں تھے اور سایوں تک پہنچ نہ پائے تھے۔

ایک ایک دو پرندے پاس ہی کے ایک پودے سے اڑے اور بیری کی ٹہنی پر بیٹھ کر محو اختلاط ہو گئے۔ میری نظر میں ان پر جم گئیں تو کسی نے ہاتھ بڑھا کر میری آنکھیں ڈھانپ لیں۔ میں نے تڑپ کر گرفت سے نکلنا چاہا تو باہوں کے حلقہ زنجیر میں جکڑ کر رہ گئی۔ عظیم پیر دبا کر پتہ نہیں کب مجھ تک آپہونچے تھے۔ ان کے قدموں کی چاپ یا تو میں نے سنی نہیں یا پھر مجھے اپنے دل کی دھڑکن کا گمان گزرا ہو گا جو میں نے اس کو نہیں پہچانا۔

بیری کے ان درختوں سے پرے ذرا سے نشیب میں ایک بھاڑی کے نیچے ایک ہلکی سی چھنسنائی دی۔ میں اور عظیم جدا ہوئے تو یہ چھنکراہ میں بدل گئی۔ لیکن میں ابھی تک اپنی ہی آگ میں جل رہی تھی۔ میرا سارا وجود خود ہی ایک چھن بن کر رہ گیا تھا۔ میری تہی خود ہی مجھے ایک کراہ معلوم ہو رہی تھی۔ اور مجھ میں بیدار ہوتا ہوا عورت کا پسند اس منٹھاس میں تلخیاں کھول رہا تھا۔ اور پاس ہی کوئی کراہ رہا تھا۔

بالکل اس طرح جیسے میرا وجود کراہ رہا تھا۔ میری زنجی روح کراہ رہی تھی۔ عظیم سے جب اہو نکر میں بڑی بے دلی اور سردہری سے آگے بڑھنے لگی تو اس کراہ نے دامن دل کو پھرتے تھا۔

دافنی کوئی قریب ہی تھا۔

میں نے پلیٹ کر عظیم کو صرف اس لیے دیکھا کہ ان سے کہہ سکوں کہ وہ اس کراہ کی تہہ تک پہنچیں۔

وہ بھانپ گئے۔ کہنے لگے تم بھی چلو۔ دیکھتے ہیں۔

میں زندگی بھر کے لیے علیم کا قرب چاہتے ہوئے بھی کم از کم اس وقت ان سے دور رہنا ہی چاہتی تھی تاکہ وہ میری سے پوری طرح متاثر نہ ہوں کیونکہ ان کا قرب میرے علم و غم کے اظہار کے لیے مشکل تھا۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر تو وقت کر کے انھوں نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے التجا کر رہے ہوں لیکن جب میں نے نظر میں پھیر لیں تو وہ آگے بڑھ گئے۔

بھاڑی کے قریب پہنچے تو نشیب میں انھوں نے جھانک کر دیکھا اور ٹھٹھک سے گئے۔

میں نے دور ہی سے پوچھا کیا بات ہے۔ انھوں نے اشارے سے مجھے قریب

بلایا۔

پہلے تو میں نے ہنس و پیش کیا۔ پھر کراہنے کی آواز سنی تو دم خود بخود اٹھ گئے۔

قریب پہنچی تو علیم نے مجھے سہارا دے کر نشیب میں جھکایا۔

وہاں تو باجی کانٹوں میں لکھی ہوئی پڑی تھی۔

میرے تن بدن میں اگ سی لگ گئی۔ میں نے علیم سے کہا۔ کو دیر بیٹھا آپ بھی۔ اٹھا لائیے بے چاری کو اب تو وہ چلنے کے لائق بھی نہ ہوگی۔ آپ ذرا سا اٹھالیں تب ہی بیڑا پار ہو۔

طنز کے یہ نثر علیم نے سہہ لیے اور چپکے سے نشیب میں سنبھل سنبھل کر اترنے لگے۔ مجھے ان کی یہ حرکت اور بھی بری لگی کہ انھوں نے میرے دل کی لگی کو سمجھ کر

بھی اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔ چھوٹے منہ تو کہہ دیتے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔
 علیم نے جھک کر ساجی کو سہارا دیا تو اپنی دو فوں باغیوں ان کی گردن میں حائل کر
 وہ جھول گئی۔ اور اتنی سفاکی سے — کہ میں جل گئی۔

یہ معاندانہ رویہ اس طرح کھلے بندوں ساجی نے کبھی اختیار نہ کیا تھا۔ میرا
 اپنا عالم یہ تھا جیسے میری اپنی لاش کا آخری دیدار کرنے کے لیے میں نے ہی اپنا کفن
 سر کا ہیڈور میں اپنے مردہ چہرہ پر حسرتوں کی ریکھائیں پڑھ رہی تھی کہ جیسے ساجی
 نے نفرت سے چہرہ ڈھنگ دیا۔

علیم سہارا دیکر اسے اوپلے آئے تو وہ بدقت تمام علیم کے سہارے لنگراتی
 بیوی مجھ تک پہنچی۔ اور میرے قریب آکر یکایک اچھل پڑی۔
 پھر اچھی بھلی تائیاں بجا بجا کر بیٹنے لگی۔

میری حالت دیدنی تھی۔ اس سے اچھا تو یہ تھا کہ ساجی مجھے طمانچہ لگا دیتی
 بلکہ بچھی سے میرا سارا سینہ بھلنی کر دیتی۔ میرے دل میں ایک نہیں کسی پسل کی گویاں
 اتار دیتی۔ مجھے تو یہ احساس ہوتا کہ میں اس کے برابر کی کوئی ہستی ہوں۔
 لیکن ساجی نے ایسا کچھ بھی تو نہ کیا۔ میرے پن دار کو، میری زندگی کو، میری
 محبت کو اس نے اپنے قدموں پر جھکایا ان کی تذلیل کی تو پھر کھڑک لگا کر جیسے جھ
 سے کھینٹنے کے سے انداز میں تائیاں بجا کر بیٹنے لگی۔

مجھ سے رہا نہ گیا۔ کسی اندرونی جذبے نے میرا ہاتھ اٹھوا دیا قریب تھا
 کہ اس کے گالوں پر میں طمانچہ جو دیتی کہ علیم نے میرا ہاتھ تھام لیا۔
 علیم کی اس طغیانی نے جلتے پرتیل کا کام کیا اور میں کانپ کانپ

کئی پھر ضبط کے سارے بند ٹوٹ کر آفسو اس طرح میری آنکھوں میں اٹھ آئے کہ
میں نے بھی ان طغیانوں میں بہہ جانے کو اپنی عافیت جانا — میں اتنا روتی کہ
میری ہچکیاں بندھ گئیں۔

سامی نے مجھے اس طرح بے حال دیکھا تو سہم کر رہ گئی۔

پھر بیکایک اس نے سر میرے سینے پر ٹیک دیا۔

رند سے ہوئے گلے سے وہ کہنے لگی — روحی میں اس وقت بہت خوش
ہوں لگی۔ اس لیے کہ آج میں اس قابل ہو گئی ہوں کہ تجھے تیری وہ خوشیاں بھی لوٹا
دوں جو میں نے اپنے لیے اٹھا رکھی تھیں لیکن تو نے مجھے بالکل غلط سمجھ لیا ہے کچھ
پتہ ہے تجھے — میں نے آج تک دوسروں میں صرف خوشیاں ہی تقسیم کی ہیں اور
سارے غم اپنے ہی پلو میں باندھ رکھے ہیں۔

خالد نے ایک دن چنبیلی کی کچی کلیاں میرے دامن میں ڈال کر کہا تھا یہ
ذکیہ کو چپکے سے دے آنا۔ میں اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ یہ کلیاں میں کیوں نہیں
رکھ سکتی۔

عید کے بھرے گھر میں عرفان نے میرا ہاتھ پکڑ کر بڑے چاؤ سے مجھے گھیسٹا
میں ہاتھ چھڑا کر لمبی لمبی سانسیں لیتی اس کی نظروں سے ادھل ہو گئی — دل نے
اس مختصر سے حادثہ کو کیسے کیسے رنگ دیے ہیں۔ میں نے کسی کسی خیالوں کی دنیا
آباد کی — اسے پائیں بارغ کے کنج میں کسی کا منتظر پایا تو اس طرح چلی گئی
جیسے جانتی ہی نہیں کہ وہ وہاں کسی کا منتظر ہے وہ لپک کر تجھ تک پہنچا بڑے چاؤ
سے اس نے مجھ سے کہا — ”یہ عید کا رڈ رالی کو دے آؤ نا سامی —“

میں تیرے لیے۔“

اور میں عید کا مڑے کر چلی گئی۔ رانی کے ہاتھ میں چپکے سے تھما دیا تو اس نے کہا یہ پانی کے قطرے کہاں سے ٹپکا لائی۔ میں رانی کو کیسے بتا دیتی کہ وہ پانی کے قطرے نہیں تھے۔ میرے آنسو تھے جو عرفان کی لکھی ہوئی تحریر کو دھندلا رہے تھے۔

پھر۔۔۔ پھر علیم نے میرے سہارے تم تک پہنچنے میں بہت ہی دیر لگائی اتنی دیر کہ میں خود ان کے سہارے کچھ دور چل پڑی تھی۔ اپنے پلو کی گرہ سے گلاب کی پنکھڑیاں نکال کر اس نے میری بند مٹھی کو کھولا۔ اور نہایت ہی احتیاط سے رکھ کر پھر مٹھی بند کر دی۔

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سمندر ٹھہرا ہوا تھا۔ بہت عمیق، بہت گہرا جس کی کوئی تھا نہ تھی۔

وہ جاننے کے لیے لمبی تو میں نے دیکھا اس کی ناگوں جیسی بل کھاتی تھی لمبی زلفوں میں دو بڑے بڑے گلاب مسکرا رہے تھے۔

سیری نظروں میں علیم کی وہ تحریر پھر گئی جو ساجی کے ہاتھوں مجھ تک پہنچی کہ ”میں نے تمہارے لیے پھول کسی کول سی ایک شاخ سے جدا کیا تھا کہ اسے تمہاری زلفوں کی لمبی سیاہ رات کا چمک دار ننھا سا تارہ بنا دوں۔“

لیکن ان پھولوں کا اس سے جھلا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

پھر میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ان دونوں سیاہ ناگوں کو پکڑ لیا تو اس نے بہت تیزی سے ان پھولوں کو اپنے بالوں میں ٹھیک کر لیا جو اس کی دانست میں اس کی گھنی

زلفوں کے ایک بال بھونے سے بھی گر سکتے تھے۔ اور اس نے خود ناگن کی طرح بل کھا کر، تڑپ کر مجھے دیکھا۔

”استنہ پیارے ہیں تجھے یہ پھول؟“
 ”ہاں۔۔۔ انہی پھولوں نے تو مجھے اتنا پانگلی بنا دیا تھا۔ ساجھی کہ میں تجھے ہنسنے کی بجائے رُلا بیٹھی۔“

میں نے اس کی گردن میں باہیں ڈال دیں۔ ”مجھے نہیں بتائے گی۔“
 اس نے قریب قریب اپنے ہونٹ میرے کان پر رکھ دیے۔ اور بہت آہستہ سے کہا۔
 ”وہ ابھی ابھی کچھ دیر پہلے اس جھاڑی کے پاس میرے منتظر تھے۔ میں قریب پہنچی تو انھوں نے بڑھ کر جب یہ پھول پیش کیے اور نظر میں جھکا لیں۔ تو میں نے پوچھا۔
 ”یہ پھول میں کسے دے آؤں۔“ جلدی سے بتا دیجئے۔“

وہ خاموش رہے۔ میں نے پھر کہا۔ ”بتا دیجئے۔ کہ آخر یہ پھول میں کسے دے آؤں؟“

انھوں نے کتنی بے بسی سے کہا۔ کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ یہ پھول تمھاری نذر کر سکوں۔ اور ان کی آنکھوں سے گرے ہوئے آنسو انہی پھولوں کے سینے میں کہیں چھپ گئے ہیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر پھول ان کے ہاتھ سے لے لیے اور خود ہی انھیں اپنے بالوں میں سجایا لیا۔

ساجھی اتنا کہہ کر میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

میں نے بھی اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ آنسو کا سمندر ساجھی کی آنکھوں ہی میں کہیں گم ہو گیا تھا اور اب وہاں سکون اور شانتی کے لمبے سائے تھے۔

کون تھا وہ —“ میں نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

”ادب سے نام لے چکی —“ اس نے پھر اپنے ہونٹ میرے کان پر رکھ دیے۔

”تیرا بھائی بُھان —“ میں ترپ کر رہ گئی — نہ خوش ہو سکی، نہ ساجی کو

گدگدا سکی

تو، تو، میری بھابی —

ہاں — ساجی نے بات کاٹ دی اور اپنے بالوں میں سبکے ہوئے پھولوں کے
سو جتن سے بھرتی ہوئی آؤدھ ہونوں کی طرح پھلانگیں لگاتی ہوئی ہماری نظروں سے
ادھل ہو گئی۔ —

میری پہلی بھابی کو مرے کوئی چار برس ہوئے تھے اس وقت بھائی بُھان کے
تین لڑکیاں تھیں ان کی سب سے بڑی لڑکی، ساجی سے دو ایک برس بچھوٹی ہو گئی۔
میں بھولی گئی کہ میری ایک بند مٹھی میں گلاب کی پنکھڑیاں لپی ہیں۔ — کچھ
پنکھڑیاں گر کر کھر گئیں تو علیم نے تیکھی نظروں سے مجھے دیکھا پھر کہنے لگے: ”کچھ بتاؤ بھی
روحی آؤ کیا بات ہے؟“

میں نے کہا — چلیے آگے چلیں — ہم ساجی سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

تین مسافر

بیچ تو کا بنا ہے بیخبرہ اس میں بیٹھی مینا
مینا کی گت مینا جانے جھینک لائی دنیا

اپنی لاکھڑی سے آنکھوں کا کام لیتا ہوا وہ کپڑا ٹنٹ میں مسافروں کے بیچ راستہ ٹوٹتا ہوا گارہا تھا آواز اچھی خاصی تھی یا پھر ماحول کی اداسی نے شاید اس کی آواز میں سنسنے والوں کے لئے زیادہ درد بھر دیا تھا۔ اللہ کے نام پر پیسہ مانگنا ہو تو دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی غیر یقینی کا ذکر کر کے اللہ سے خوف دلانے کا گورہانا سہی لیکن ہے کارگر اور پھر اسی صورت میں جب کہ لوگ اپنی ہی آنکھوں زندگی کی بے مائیگی کا حشر دیکھ رہے ہوں۔

ایکپرس اپنی پوری رفتار سے جا رہا تھا۔ ساری کائنات اندھیرے میں لپٹی ہوئی تھی۔ کھرکیوں اور شیشوں سے جو روشنی زمین پر پڑ رہی تھی وہ بھی ایکپرس ہی کی

رفتار سے اس کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ اندھیرے میں کھوٹے پودے، درخت، اتار کے کھجے، سکند، دیسکنڈ کے لیے اجالوں سے چٹ کر پھیں اپنی یاہوں میں جکڑ لینا چاہتے تھے لیکن اجائے بڑی بے رحمی سے انھیں تاریکیوں میں پھینک کر آگے بڑھ رہے تھے۔ البتہ کپارٹمنٹ اجالوں سے بھرا ہوا تھا۔ کتنی ہی زندگیاں سر جوڑے موت کے خلاف سازش کر رہی تھیں اجائے صرف کپارٹمنٹ میں تھے۔ سفر کرنے والوں کے سیڑیوں میں بھی جیسے باہر کی تاریکیاں در آئی تھیں۔ اور وہ گارہ تھا۔

بیچ تیر کا بنا ہے بیخبرہ

ایک بوڑھی بیوہ برہنہ گتھے سر پر سفید ساری کا پلو اور بھے آنسو خشک کر رہا تھی ایک لمبے بالوں والا دبلا پتلا سا نوجوان سگریٹ ہونٹوں میں دبائے کھڑکی سے لگا ہوا شیشے میں سے پھنتی ہوئی روشنیوں کو نکلے ہا تھا جو اندھیروں سے گھبرا کر اس کی نظروں کے ساتھ بھاگ رہی تھیں۔ ایک اینگلو انڈین ادھیڑ عمر کی فرہ عورت اپنی عینک کے شیشے اسکرٹ کے دامن سے صاف کر کے عینک کو اپنی آنکھوں کے سامنے گھما رہی تھی اور یہ عمل اس نے دو تین بار کیا تھا۔ ایک نرہ عورت اپنی اور ڈھنسی میں اپنے بچے کو چھپائے دودھ پلا رہی تھی لیکن وہ اس قدر سہمی ہوئی تھی کہ اس وقت بھی اس کے چہرے پر درد و رنج مانتا کا پتہ نہ تھا۔ ایک پہلوان قسم کا گھٹے ہوئے سردار نو کدرا موچکھوں والا آدمی اب اپنی موچکھوں پر تاد دینا اس طرح بھولا ہوا تھا۔ جیسے یہ اس کی عادت ہی نہ ہو۔

بھک سفید داڑھی والے ایک مولوی صاحب منہ ہی منہ میں کچھ درد کرتے ہوئے بہت جلد جلد تسبیح کے دانے پھیر رہے تھے ان کی آنکھیں کبھی بند ہو جاتیں

بھی کھل جاتیں۔ دد چار آدمی ایک پنڈت کو گھیرے ہوئے اس کی معلومات افزا
 نہیں سُن رہے تھے بیچ بیچ میں کوئی کچھ پوچھ لیتا۔ لیکن مکرر پوچھنے کی یا تو ہمت نہ کرتا
 پھر دانستہ گریز کرتا۔ پنڈت جی ذہنی طور پر اندھے بھکاری کے گائے ہوئے
 دہے سے زیادہ قریبی ربط ضبط رکھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

بیچ تو کا بخرہ بنا ہو، اس میں بیٹھی مینا
 مینا کی گت مینا جانے، جھکیں لاگی دنیا

ادھر ابھی تاک گار رہا تھا۔

”کس طرح پھینک دے گا اٹھا کر کوئی، کوئی کہہ رہا تھا آواز میں رقت تھی۔
 ”ہاں بھاڑیہ غم تو زندگی بھر کا ہے لیکن مذہباً یہ عمل قابلِ ترمیم ہو تو گریز سے
 فائدہ۔“ آواز میں دور دور تک کسی جذبے کا پتہ نہ تھا۔

اب آپ ہی سمجھائیے مولوی صاحب۔ پنڈت جی نے اس آواز کی طرف
 مخاطب ہو کر کہا۔

دد دھ پلاتی ہوئی سندھی عورت نے راست چیتن بابو سے سوال کیا یہ بھکاری
 عورت کہاں ہے جی۔“ لیکن چیتن بابو بس مبہوت بنے سامنے پڑی ہوئی اپنے
 محنت جگر کی لاش کو تک رہے تھے جس نے ابھی کچھ ہی دیر پہلے دم توڑا تھا
 سندھی عورت کا سوال ان کے کانوں تک پہنچا ہو گا لیکن جس سماعت تک پہنچ
 سکا یا نہیں۔ اس کا کچھ علم نہ ہوا۔ اس لیے کہ چیتن بابو نے اس کی طرف نظر اٹھا
 کر بھی نہیں دیکھا۔

پاس ہی بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے کہا۔ ”کچھ ہی ماہ ہوئے ہیں وہ

بیکٹھ سدھا رکھی ہیں۔ مجھے اکھوں نے بتایا تھا۔“

”چلو جی اس کی مافی تو اس کے سوا گت کے لیے وہاں ہے۔“ سندھی عورت نے بڑے ہی اطمینان سے یہ بات کہی جیسے اس نے سوال ہی اس جواب کی امید میں کیا تھا۔

پنڈت جی گنگا کی پوترتا، فضیلت اور تقدس کی باتیں کر رہے تھے، اندھا بھکاری اب خاموش ہو چکا تھا۔ اور اپنی لاکھٹی تھامے کپا رٹسٹ کے دروازے سے پیٹھ لکائے اکڑوں بیٹھا بیڑی کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔

چیتن بابو اپنی کچھلی زندگی کے شاداب شاداب دپرافوں میں بھٹک رہے تھے۔ اپنی پتی کی سیندر بھری مانگ کو پہلی بار چوم لینا ہی ایک نئے تہمان کی آمد کا پیام بن گیا تھا اور جب یہ بات ان کے کانوں تک پہنچی تھی تو وہ خوشی سے بادے ہو رہے تھے انھیں اندازہ تھا کہ..... الہ آباد سے اپنا میکہ چھوڑ آنے کے بعد ان کی گڑیا سی دھرم پتی کتنی اداس اداس سی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی تو چیتن بابو سے آنکھیں چار ہوئی ہیں تو جھٹ بنا رہی ساری کے پلوٹنے ٹیڑھی ٹیڑھی گھنی گھنی پلکوں میں جھل مل کرتے آنسوؤں کو جذب کر لیا ہے۔ پھر پھسکی پھسکی سی مسکراہٹیں نازک سے ہونٹوں پر اس طرح پھیلی ہیں کہ ٹیڑھی ٹیڑھی گھنی پلکوں کے آنسو ماند پڑ گئے ہیں لیکن چیتن بابو کو یہ تھا کہ ان مسکراہٹوں کے پیچھے بابل کا گھر چھوٹنے کے دبے دبے غم کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں بھی تھپی ہوئی ہیں۔ جو بہر حال ان آنکھوں سے تو نہیں چھپ سکتی تھیں جو دل کی بات سمجھتی تھیں۔

اب جو ننھے کی آمد آمد کی خبر چل نکلی تو اڑدس پڑدس میں دیکھتے کے دیکھتے

سب ہی نے سنا۔ لیکن اس میں نہ کوئی اچنبہ کی بات تھی نہ چونک پڑنے کی۔ وہ لوگ جین بابو سے تعلق خاطر تھا۔ انھوں نے انہیں چھیڑا بھی، مبارک باد بھی دی۔

رنگ برنگ کی ساریاں گھر کے برآمدے میں لہرائیں، سرسرائیں، پھر ان رنگوں کے بچوں بیچ جیتن بابو کی بیٹی نے ایک اور رنگ کا اضافہ کیا۔ پھر سیلیوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ دپائے، ٹھوکے دیے، چٹکیاں بھریں اور جیتن بابو کی دھرم بتی بجاتی رہیں، سٹپٹی اور سکراتی رہیں۔

اٹنا آیا بھی تو بڑی دھوم دھام سے آیا۔۔۔ الہ آباد سے جیتن بابو کا ساک کا سا سسرال حیدر آباد اکٹھا آیا تھا۔

جہنم پتیاں دکھی گئیں نام رکھا گیا تو لہو تقسیم ہوئے مندر سے لمبی جٹاؤں والے فقیر پکڑوائے گئے۔ انہیں پیٹ بھر کھلایا گیا۔ پنڈتوں کے جہنی کے لیے خاص اہتمام کیے گئے۔

جیتن بابو کی سسرال نے بنگوڑے کی رسم میں دل کی ہر خواہش پوری کی۔ ایک نہیں کہی جوڑے قریص، بش شرٹ، بابا سوٹ، سید سوٹ، بنیا بن موزے، سوٹر، کسٹوپ، پھر کھلونوں کا اچھا خاصا چھوٹا سا خزانہ۔

اس کردار سے آئے ہوئے نئے ہمان نے ان سے استفادہ کرنے کی جیسے قسم کھا رکھی تھی۔ شفا بیچارہ سدا کا مرل تھا، ذرا منہ پر پانی آیا کہ پھر کچھ نئی نکال بیٹھا۔ نہ غوں نہ غاں۔ ”مک مک دیدم دم نہ کشیدم“ کے مصداق پڑا بڑا ٹکڑا کر مال کا منہ تکے جاتے۔ سال بھر کے ہوتے ہوتے دنیا بھر کے بچے تو دنیا بھر ہی کا اثاثہ ہوتے پھرتے ہیں۔ رکھنے کی چیزوں کو توڑتے ہیں توڑنے کی چیزوں کو جوڑنے کی

کوشش میں اور بھی توڑتے پھوڑتے ہیں۔ لیکن ننھے کی عمر سال بھر سے اونچی ہو گئی
 پھر دیکھتے دیکھتے دو سال کی زندگی کا تجربہ ان کے پیچھے تھا لیکن اس کو کچھ بھی نہ آیا
 بس رونے سے مطلب تھا۔ ہنسا بھی تو سورتا ہوا محسوس ہوتا۔ چھین چھناتی مٹھی اور
 جھنجھنے سے گزر کر عمر کا کارواں لکڑی کے گھوڑے اور گیند بلبے تک آ پہنچا
 تھا۔ لیکن ننھا بس اس طرح جے جا رہا تھا۔ جیسے کسی چیز سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔
 دوڑنے بھاگنے کی عمر میں رینگنے کی کوشش کرنا اس بات کی دلیل تو نہ تھی کہ
 ساتھ کے بچے جو ان ہوں گے تو ننھا بچا رہ انکو کھڑا چوتنا پھرے گا اور پھر ماں کا دل
 ماں کا دل ہے۔ دنیا اسید پر قائم ہے۔ ننھے کے ان ساری کوتاہیوں کے باوجود
 اللہ تلے تھے۔ مندروں میں دیے جلائے جاتے۔ پنڈتوں کو دان دیا جاتا۔ یہاں تک
 کہ بھگوان کے نام پر گوماتا چھوڑی گئیں۔ مندر میں دیے جلتے رہے۔ پنڈتوں
 کو دان ملتا رہا۔ گوماتا کبھی سبزی والی کی ٹوکری پر کبھی غلے والے کی بوری پر
 منہ جلاتی اور ہنہرٹ کھاتی رہیں۔ لیکن ننھا بے چارہ بچوں کا توں رہا۔
 یہاں تک کہ رنگ برنگی ساریاں گھر کے برآمدے میں پھر لہرائیں۔ سرسراہٹیں
 پھر ان رنگوں کے بچوں بیچ جیتن بابو کی دھرم پتینی لجاتی رہیں۔ سمٹی اور سرکڑتی رہیں
 پھر دیکھتے دیکھتے ایک اور زندگی کا اضافہ ہو گیا۔

سنے کی آمد نے ننھے کی قدر و منزلت میں بہت کمی کر دی۔ کرنے والوں نے
 یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر کیا اور — محسوس کرنے والوں نے بھی غیر شعوری
 طور پر محسوس کیا۔ اب نہ ننھے کے وہ جو بچلے تھے نہ ٹھاٹھ باٹھ جیتا جاگتا برابر کا
 حق دار پیدا ہو گیا تھا۔ جیتن بابو کی پتینی دیے اس سے غافل نہ تھیں بلکہ وہ تو

ابھی تک ننھے ہی پر زیادہ رکھی ہوئی تھیں لیکن مناجی تو سینے سے چپٹ کر دو دھپتیا تھا۔ جوں جوں دن گزرتے گئے منے کے کارناموں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ جو بات ننھے نے نہیں کی تھی منے نے سب کچھ کر دکھایا۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے ماں کے دل میں اس طرح ہاتھ پاؤں پھیلانے کہ منا بیٹا منارا جہ بن بیٹھا۔ بات کہنے کی نہیں لیکن محسوس تو کچھ یوں ہی ہوتا ہے کہ دلوں کی دونوں بستیوں پر منارا جہ کی حکومت ہے جیتن بابو کی محبت کچی کھلے بندوں دیکھی اور سمجھی جاسکتی تھی۔ علانیہ معلوم ہوتا تھا کہ ترازو کا جھکاؤ کس طرف ہے، لیکن ماں کا معاملہ بڑا گنجھیر ہوتا ہے حکم نکالنا مشکل ہی تھا منا کہ منارا جہ نے ننھے کو ماں کے دل سے نکال پھینکا ہے۔ کبھی کبھی کچھ ایسا اندازہ ہو بھی جاتا تو دوسرے لمحے ہی یہ بات بالکل جھوٹ معلوم ہوتی۔ کچھ دنوں سے ننھے کی صحت کچھ ادرگر گئی۔ علاج معالجہ میں جیتن بابو نے کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا تھا۔ لیکن مایوسی اُن تھیں کہ بڑھتی ہی جاتیں۔ پھر ایک دن مختصر سی علالت کے بعد ان کی دھرم پتی سورگباشی ہو گئیں تو جیتن بابو کچھ اس طرح دل تھامے زندگی بسر کرنے لگے جیسے ان کی پتی دنیا سے اٹھ کر ان کے من میں آبراجی ہوں۔

ننھے کے لیے انھوں نے سب کچھ کر دیکھا۔ ہر حور ماں کی تمنا تھی کہ کاشی جا کر ننھے کی صحت دہاں سے مانگ لائیں۔ پنڈتوں نے بھی جب اس خواہش کو ہوا دی تو جیتن بابو بالکل پڑے پڑے تھے۔ ننھا اور مناد دونوں ہی ساتھ تھے ننھا پانچ سال کا ہو چکا تھا۔ لیکن تین سال کے منے سے دیکھنے میں کم ہی لگتا۔

اور اب ننھے نے منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں جیتن بابو کا ساتھ

بھوڑ دیا تھا۔ مناد دوسری برتھ پران کے برابر ہی سو رہا تھا۔ اور وہ بھرے کپڑے
میں تھا تھا تنہا سے بیٹھے اس خیال سے الجھ رہے تھے کہ اپنے جگر گوشے کو رات
کی اس بھیاں تک تاریکی میں کس طرح اٹھا کر گنگا مانی لگی آغوش میں پھینک سکیں گے
وہ امانت جو مستقبل کے ہاتھوں سوہنی جانی تھی کس طرح دریا کے حوالے کی جاسکتی تھی۔
جیتن بابو کے دل میں ایک سمندر ٹھہرا ہوا تھا۔ پتہ نہیں کس کے انتظار میں
تھا یہ سمندر یا نکل خاموش، ایک لہر نہیں ایک موج نہیں۔

اور گنگا مانی اپنی پوتہ کے ساتھ ان کی جانب بڑھ رہی تھی۔
انجن مسلسل چلکا رہا تھا پنڈت جی کی باتیں انجن کی کرخت چیخ و پکار میں
دب دب جاتی تھیں وہ کہہ رہے تھے۔

”راجہ سکر نے ایک رشی سے ناز بیاہنا دیکھا تھا۔ اس کے شراب سے
راجہ سکر کا سارا خاندان پتھر کا بن گیا۔ بھگوان کی لاکھی بے آواز ہے بھائی۔“ پنڈت
جی کا مزید لکچر اس کے بعد سنائی نہ دیا۔ انجن کے تازہ دم ہونے کے لیے لمحہ بھر کو
چیخ و پکار بند کی۔ تو پنڈت جی کی آواز پھر ابھری۔ دشمنوں نے بھاگرت سے کہا
کہ دیکھ لو کہ میں گنگا بہتی ہے۔ پر لو کہ تک لے آئے گا۔ کچھ تو پتھر کی سورتیوں
میں پھر سے جان پڑ جائے گی۔“

انجن نے باہر کی تاریکیوں، سناٹوں اور پنڈت جی کے علم و دانش کی روشنیوں
کو جیسے بیک وقت ہلکا کر دیا اس کی چیخ و پکار میں پنڈت جی کی آواز پھر کہیں
کھو گئی۔ لیکن پنڈت جی جیسے اب انجن کی گستاخی سے جھلا اٹھے تھے انھوں
نے بھی اپنی آواز بند کی۔

”گنگا جی اس دنیا میں براجیں اور پتھر کی مورتیوں میں جان پڑ گئی۔
 گنگا جل امرت ہے۔ گنگا جل کلیان ہی کا شبھ نام ہے۔“
 چیتن بابو گنگا مائی آپ کی خود جل کر آ رہی ہے کلیان کے لیے اس سے
 سیدھا اور راستہ نہیں ہے۔ چیتن بابو، ”پنڈت جی اپنی آواز میں اعتماد
 پیدا کر رہے تھے۔“

انجن فرائے بجھتا ہوا گنگا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گنگا چیتن بابو کی طرف خود
 جل کر آ رہی تھی۔

چیتن بابو کے دل میں ایک سمندر کھڑا ہوا تھا۔ انجن فرائے بھڑتا ہوا۔
 گنگا مائی کے سینے پر جل رہا تھا۔ ”گنگا مائی یہ کچھ چھوٹ رہی ہے چیتن بابو۔
 سے بیت رہا ہے۔“

چیتن بابو دیوانوں کی طرح اٹھے اور انھوں نے اپنے تحت جگر کی لاش
 گنگا میں پھینک دی۔

ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ منا اپنی برکت پر نہیں تھا اور ننھے کی لاش سننے
 رکھ پر پڑی تھی۔

کینڈل کالونی

(مقام اور کردار سب کے سب قطعی فرضی ہیں اگر آپ چاہیں تو سامان کی فہرست اور لکھنے والے کو اصلی سمجھ سکتے ہیں)

اُس پیاسی اور بخر دھرتی کی مانند جس پر بادل اڑا کر چھائے تھے لیکن تیز ہواؤں نے انھیں اڑا کر کمبل اور برسنے کے لیے چھوڑ دیا ہو۔
کوئی ان محبتوں کے لیے جو دوسروں سے اس کو نہیں ملتی ہیں ترس تو سکتا ہے۔ لیکن ابا کی ایک اور محرومی تھی۔

وہ آدمی جو اپنی ہی محبت بے دریغ دوسروں پر لٹانا چاہے۔ لیکن نہ لٹا سکے یہ اسی محرومی ہے جو سنا ظاہر کر آدمی کے دل میں بس جاتی ہے۔

یادوں سمجھیے جیسے بادل اڑا کر اکٹھے ہوں جھوم جھوم کر چھاتے ہوں لیکن برس ہی نہ پاتے ہوں اور ان کے وسیع سینے میں چھپا ہوا ٹھنڈا میٹھا پانی کنکر پتھر بن کر ان کے اپنے سینے کا بوجھ بن جاتا ہو۔

”ابا“ ساری کینڈل کالونی کا ابا تھا۔ میں نے گریہ دار کے ناطے اس کی

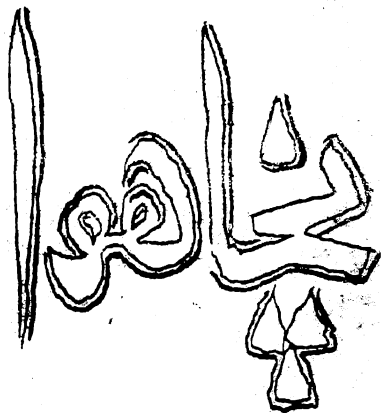
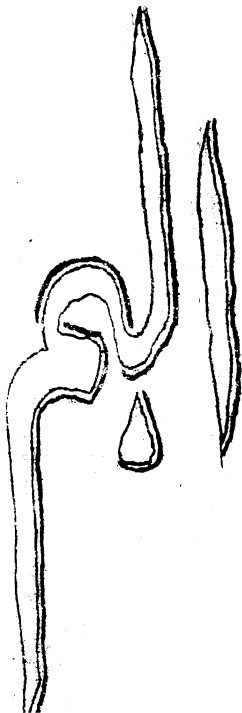
اولاد معنوی کے انبوه کثیر ہیں ایک خاندان کی حیثیت رکھتا تھا۔ پہلے پہل جب مجھے اباسے سابقہ پڑا تھا تو اس نے مجھے کانچ کے سامان کی دوکان سے اٹھائے ہوئے مٹی کے مادھو کی طرح برتا تھا مالک دوکان نے اگر کانچ کے سامان میں مجھے بھی سجا دیا تو میرا کیا دردش لیکن خریدار نے مجھے ہی تصور وار ٹھہرایا کہ میں اس دوکان کا اہل نہیں تھا۔ اور میرے اس جرم کی ابانے مجھے خوب خوب سزا دی۔

میرا جرم یہی تھا کہ میں تلب شہر میں جہاں رہنے کی تمنا میں بڑے بڑے کھاتے پیتے لوگ اپنی موٹروں کے طائر گھستے پھرتے تھے۔ لیکن انھیں رہنے کو اس کالونی میں مکان نہیں ملتا تھا۔ وہاں میں موٹروں کے طائر نہیں پسے ہوئے گھستے پھر رہا تھا۔

ابانے مجھے سر سے سیر تک دیکھا تھا۔

پھیر پیر سے سرتک دیکھا۔

وہ بلا شرکت غیرے ساری کالونی کا مالک تھا۔ اولاد اس کے بچی نہیں۔ چھوٹے بڑے خوبصورت سے کوہڑے اور وہاں میں بستے ہوئے رنگ بنگے سامانوں کے درمیان کانچ کے بنے ہوئے نازک نازک سے لوگ۔ یہ تھے اباس کے کرایہ دار جو موٹروں میں اڑتے تھے اور فرش پر جوتے پہن کر چلتے تھے کالونی کے اسی کارگاہ شیشہ گراں میں، اپنے مٹی کے گھر دندے کا سارا اثاثہ لیے میں بھی چلا آیا۔ اور یہ سب کچھ اس وقت ہو سکا جب کہ ”ابا“ نے مجھے الٹ پھیر کر اچھی طرح دیکھ لیا کہ میں کہیں سے ٹوٹا پھوٹا نہیں ہوں۔ مجھ میں کوئی کسر نہیں ہے گھر کے لیے میری ضرورت در حاجت مندی یقیناً ایسی ہے کہ اس کالونی میں دو پورے جو بھائی کرتا پڑے



اور جسے سمجھوں نے چھوڑ دیا ہے، مجھے دے دیا جاسکتا ہے۔ مجھے ”ابا“ نے اس کے باوجود تین چکر کروائے اور جب میں نے مایوس ہو کر اس سے اس ضمن میں ملنا چھوڑ دیا تو وہ خود مجھے شہر کے پرانے بازار میں اپنی لمبی چوڑی قیمتی سی کار میں بیٹھا ہوا ملا۔ خود اس کے بلانے پر میں جب اس کے قریب پہونچا تو اس نے کہا۔

کیوں صاحب آپ کو گھر نہیں چاہیے۔

مجھے ایسا لگا جیسے ”ابا“ سر راہ ہے کسی غریب شہر کو چھڑ رہا ہو اس کی ٹوپی اچھاں رہا ہو۔ میں باوجود کوشش کے یہ نہ کہہ سکا کہ مولانا بلا ناغہ تین روز میں کوئی آپ کے دیدار کے لیے نہیں حاضر ہوتا رہا ہوں۔ میں ایسی بات کس طرح کہہ سکتا تھا۔ لہذا میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ بس ہاتھیں کھل کر رہ گئیں میری زندگی کی ایسی ضرورت پوری ہو رہی تھی جس ضرورت کا اندازہ باری تعالیٰ کو ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ جو عرض و فرش پر، حجر و شجر پر، شیشہ و سنگ میں آب و آتش میں، خار و مغیلاں سے گل تر تک، لوگ خار میں بھی اور برگ گل میں بھی جہاں چاہے جس وقت چاہے رہ سکتا ہے تو اس کے لیے مکان کی قلت کا مسئلہ کوئی مسئلہ ہی نہیں اس لیے یہ مسئلہ تو صرف غریب بندوں ہی کے حصے میں آیا ہے جس کی نسبت آپ اسے رجوع بھی نہیں کر سکتے۔ اور اسی لیے میں نے ”ابا“ کو ایسی محبت کی نظر سے دیکھا جس سے اس کی منہ بھی غما برہوتی تھی۔ اس لیے کہ وہ میری زندگی کی سب سے بڑی ضرورت کو پورا کر رہا تھا جس کا وعدہ باری تعالیٰ نے نہیں کیا ہے اس لیے کہ گھر کوئی رزق تو ہے نہیں۔

اب میں کینڈل کا لوئی میں خلا کے مسافر لگاری کی طرح اس انداز سے
دارد ہوا جیسے فاتحِ زمان و مکاں ہوں۔ اس لیے کہ میں نے ابا کا دلی جیت
لیا تھا جس نے مجھے اپنی کا لوئی میں رہنے کے لیے ایک فلیٹ دیا ہے۔
کینڈل کا لوئی میں مجھ سے کم درجے کا کوئی شخص نہیں تھا۔ درجے
کا تعین میں نے موٹر اور کتے سے کیا ہے۔ قریب قریب ہر رہنے والے کے
پاس ایک موٹر اور ایک یا دو کتے ضرور تھے۔ یہ کتے دن کو اپنے مالکوں
خلات کا لوئی میں کانفرنس کرتے اور رات کو اس ذہنی ریاضت سے جھگ
کر اس طرح سو رہتے جیسے جانتے ہوں کہ آپس ہی میں ایک کا مالک دوسرے
کے مالک کے گھر نقب لگانا چاہتا ہے اور ساتھ ہی ایک دوسرے سے خاف
بھی ہے۔ کا لوئی کی تقسیم اور ہر پڑی کے بٹوارے کے سلسلے میں یہ مخالفتیں
اتنی بڑھ گئی تھیں کہ ایک کا مالک دوسرے کے مالک سے بڑی رات کو
اندھیرے میں نہیں ملتا تھا۔ کتوں کو باہر کے کسی راہزن کا کھلکا نہ تھا جو کبھی اپنی
نیند خراب کر کے رکھوالی کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ وہ جانتے تھے کہ کینڈل
کا لوئی میں رہنے والے سارے کے سارے لوگ ان کے اپنے مالک ہی
کی تعریف میں آتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ سب کے سب ایک ہی خاندان کے افراد
ہیں اور اگر ان میں کوئی آن بن ہو بھی جائے تو کتے اس جھگڑے فساد میں کوئی
رول ادا کرنے کو نہک حرامی کرتے۔ اس لیے ان میں بھی محبت اور پیار بھی بڑھ
گیا تھا۔ مالکوں کی ہر کانفرنس کے بعد وہ اپنی کانفرنس میں اپنے مالکوں کے
اعمال نیک و بد کا نہ صرف جائزہ لیتے بلکہ انھیں ذہنوں میں رکارد بھی کر لیتے

کھڑکی کے ان سائے مالکوں کا آبا جیسے سرغنہ تھا۔ اس لیے بھی کہ اس کے پاس کتنے بھی زیادہ تھے اور موٹریں بھی زیادہ تھیں درنی الوقت تو وہ ساری کالونی کا جیسا کہ میں نے کہا تھا بلا شرکت غیرے مختار کل تھا۔

شروع شروع میں جب میں کینڈل کالونی کے رہنے والوں میں شامل ہوا تھا تو سمجھتا تھا کہ دوسرے سارے لوگ بھی میری طرح ”ابا“ کے صرف کرایہ دار ہیں لیکن آہستہ آہستہ مجھے معلوم ہوا کہ ایرانی نژاد علی سین جو اپنی بیوی کو سات پردوں میں چھپا کر رکھتا ہے اس بیوی کو جس کے جسم پر سفید چمڑی تو ہے لیکن گوشت نہیں ہے وہ ”ابا“ کا کرایہ دار ہے اور ہاں میرے فلیٹ سے بالکل متصل وہ سندھی عورت بھی جو اپنے تن و گوش اور لچم شمع دھڑھڑاتے بدن کے بل بوتے پر اپنے شوہر کو چھو کر کہہ کر بلاتی تھی وہ بھی ”ابا“ کی کرایہ دار تھی اس عورت کا اکلوتا چھوٹا سا لڑکا بڑا پیارا سا تھا لیکن بے انتہا شریر بھی۔ وہ کینڈل کالونی کے سارے بچوں سے یکے بعد دیگرے دوستی بھی کرتا اور لڑتا جھگڑتا بھی اور جب اس کے خلاف کالونی کے بچوں کا مشترکہ محاذ قائم ہو جاتا تو وہ دوسرے بچوں سے پیٹ کر اپنی ماں سے جا چمکتا اور بینا کر کے کینڈل کالونی کے سارے بچوں کی شکایتیں کرتا، پہلوان قسم کی سندھی عورت پہلے دو ہنٹڑا اسی کی پیٹھ پر بٹھا ڈرتی پھر پھری ہوئی شیرنی کی طرح اپنے فلیٹ سے نکل کر ایک ایک بچے سے لڑتی، بچوں کی ماؤں سے اکھتی بات بات پر اپنے بچے کے اکلوتے ہونے کا ذکر کچھ اس طرح کرتی جیسے یہ اس کی بد نصیبی نہیں بلکہ کوئی ناقابل انکار راز نامہ ہے جو اس نے صرف ایک کچھ جانا اور پھر اپنے شوہر کو چھوڑے پکارنے لگی۔

”تمھارے دو ہیں — میرا تو ایک ہی ہے“

”تمھارے تین ہیں — میرا تو ایک ہی ہے“

”تمھارے کتنے سارے ہیں — میرا تو ایک ہی ہے“

ایک انسپکٹر کی بیوی نے جو اس کالونی میں موٹر کی بجائے موٹر سیکل پر رہی، اکتفا کرتا تھا سندھی عورت سے ایک دن کہا۔

بہن جی — تمھارا ایک ہی ہے تو دوسرا چپکے سے پیدا کیوں نہیں کر لیتیں۔ کالونی بھر میں چھپتی پھرتی ہو میرا ایک ہی ہے۔ مجھے تو ایک ہی ہے۔ تم کہو تو اپنے شوہر کو خدمت کے لیے حاضر کر دوں۔

وہ تو خیر گزری جو سندھی عورت نے بات نہیں سمجھی درنہ انسپکٹر کی بیوی بیماری تو یوں بھی چلتی کیا کھتی ہواؤں میں ڈولتی کھتی اور وہ بھی اس طرح جیسے پتنگ تھا پکھاتی ہو، سندھی عورت کے انتقاماً دو چار برس سے بھی اس کی جان لینے کے لیے کافی تھے لیکن سندھی عورت نے یہ بات سنی نہیں یا پھر سن کر سمجھی تھیں۔

کینڈلی کالونی کی ایک اور مشہور شخصیت جو ساری کالونی کے ذہنوں میں رات کی گہری تاریکی کے ساتھ ساتھ ابھرتی کھتی اور پو پھٹتے سمے اجالوں کے ساتھ ٹوہڑ جاتی تھی وہ انسپکٹر کے چھوٹے بھائی کی ہستی تھی، یہ ایک معمولی سا لونڈا تھا جو ابا کا قریبی رشتہ دار ہونے کے ناطے ساری کالونی کا رشتہ دار تھا لیکن بغیر کسی اجازت کے ہر گھر میں بلا بھجوا دیا گیا تھا۔ سندھی عورت، ایرانی غلام حسین، دودھ دالے غفورے میاں اور مجھ سے اس کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ ویسے ساری کینڈلی کالونی سے اس کا ناطہ یقینی تھا، یہ لڑکا ہندوستان بھر میں پھر کر گھاٹ گھاٹ کا

پانی پیتا رہتا لیکن روٹی کے انتظام کے لیے کینڈل کا لونی ہر دوسرے تیسرے مہینے ضرور آتا اور اندھیرے کی طرح لوگوں کے ذہنوں پر چھا جاتا۔ کینڈل کا لونی کا ہر گھر اس کا کفیل ہوتا اور وہ اس طرح کہ وہ اسی کا لونی میں وقفے وقفے سے ہر گھر میں ہاتھ صاف کرتا رہتا مال سروسقہ کی قیمت کا لحاظ کرتے اس کی سیاحی کی مدت مقرر ہوتی۔ کینڈل کا لونی سے قدم باہر نکال کر جب اس نے قرب و جوار میں بھی اپنی ہاتھ کی صفائی کئی مشق کا آغاز کیا تو انپکٹر بیچارہ سرکاری وردی سے سرکاری پشٹل نکال کر سرکاری جوتوں سمیت اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور اپنے فرض کی ادائی میں بھائی ہونے پر بھی کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ اور اسے اچھی طرح تنبیہ کر دی کہ جو کچھ کرنا ہو بس کینڈل کا لونی ہی میں کیا کرے۔ اس لیے کہ کا لونی کا ہر گھر اس کا اپنا گھر ہے وہاں کے رہنے والے اس کے اپنے لوگ ہیں ان کی ہر چیز اس کی اپنی ہے۔ خدا معلوم اس لونڈے کو اس بات کا پتہ کیسے چل گیا کہ میں بھی کینڈل کا لونی کے مالک کو جو ساری کا لونی کا ”ابا“ ہے ”ابا“ ہی پکارنے لگا ہوں بس اتنا معلوم ہونا تھا کہ اس نے میرے گھر کو بھی اپنا ہی گھر سمجھا اور ان دنوں جب میں ملازمت کے سلسلے میں دورے پر کسی ضلع کو گیا ہوا تھا۔ گھر کے بچے حصے کے ایک روشن دان سے داخل ہو کر جو بھی اسے مل سکتا اٹھا اٹھالے گیا۔ اس سروسقہ سامان کی فہرست میں نیچے اس لیے درج کر رہا ہوں کہ اگر آپ یہ سامان برآمد کرنے کے لیے آمادہ ہوں تو سب کا سب میں آپ کی نذر کر دوں۔ میں آپ کی اتنی مدد کر سکتا ہوں کہ اس لونڈے کا ہاتھ پکڑ کر آپ کے ہاتھ میں دیدوں سامان اس سے آپ اگوائیں اور خوشی سے اپنے گھر میں محفوظ رکھیں اور یہ کام آپ بہت آسانی

سے کر سکتے ہیں بشرطیکہ آپ کا گھر یا فلیٹ کنیڈل کا لونی میں نہ ہو اور آپ ”ابا“ کے رشتہ دار نہ ہوں۔ اور یہ لونڈا اسی رشتے والی کے سہارے ہمیشہ بچھا گیا ہے۔

سامان کی فہرست یہ ہے۔

ایک کن زلیہ، جرمین ٹیبل کلاک، ایک اگیل تھر موس۔

ایک پاندان جرمین سلور، ایک عطر دان، ایک کافی سیٹ، ای۔ پی۔ این۔ ایس۔ ایک گاگل، ایک نمبری عینک، ۲ پتلون، ۳ شرٹ، ایک انڈین پائلٹ فونٹین پن۔ الشجاع کے تین اور چارٹرے و نقش کے دو دو پرچے، داستان گو کا کہانی نمبر اور ادب لطیف کا سالنامہ، ایک اردو کتاب، باب بیٹے (ترکیف)، ایک انگریزی کتاب یا مادی ہل ہول (الگز نڈرا کو پرین) گیارہ سگریٹ کی ڈبیاں جن چھ خالی ہیں، سوڈے کے تین شیشے جن میں ایک بھرا ہوا تھا۔ سولن دھکی کا ایک بپ جو میں نے پینے کے لیے نہیں تفریگا رکھا تھا اور بھی کچھ ہوگا جو مجھے اس وقت یاد نہیں۔

دودھ والے غفورے میاں کے متعلق تو میں نے آپ کو کچھ بتایا ہی نہیں، مڑے ہوئے سینگوں کی چکنی چپڑی سیروں دودھ دینے والی کئی بھینسیں غفورے میاں کا کاروبار بڑھانے کے لیے خود تشہیر کا باعث تھیں۔ لوگ ان بھینسوں کو دیکھ دیکھ کر ہی ان کے دودھ کا تصور کر لیتے اور ان کی نظروں میں ملائی اور کھن سے بھری قابیں سما جاتیں۔ غفورے میاں بڑی احتیاط اور اہتمام سے دودھ لگا بچوں کے سامنے ہی دو ہوتا اور اس کا یہ ہنر کوئی دیکھ بھی نہ پاتا کہ اپنی کمر کے

گمردیٹے ہوئے سائیکل کے ٹیوب سے جو پانی سے بھرا ہوتا رہا بڑکی نالی لگا کر وہ کس طرح دودھ میں میٹھا اور شفاف پانی ملا دیتا ہے۔

انکپٹر کے فیلٹ کے پچھلے حصے میں دو بوڑھیاں بڑی کس پرسی کے عالم میں رہتی ہیں یہ ”ابا“ کے مرحوم بھائیوں کی نشانیاں ہیں جنھوں نے کبھی اچھے دن ضرور دیکھے ہوں گے لیکن اجالے سے اندھیرا جس طرح بھاتا ہے آج کل ان بوڑھیوں کے اچھے دن اسی طرح ان سے بھاگتے رہتے ہیں اور اس بھری پری کینڈل کالونی کی دنیا میں جہاں موٹروں کی چکا چوند ہے یہ دونوں بوڑھیاں ایسی تین چار بطلوں، چار بچہ مرغیوں اور ایک سیاہ بکری کے پیچھے صبح سے شام تک بڑے خشوع و خضوع سے اس طرح مصروف رہتی ہیں جیسے جانتی ہوں کہ کینڈل کالونی کے سارے افراد خاندان انھیں بطلوں اور مرغیوں کے سہارے چمکتی موٹروں تک پہنچانے ہیں۔ یہ دونوں بوڑھیاں انسانوں کی بستی میں روحیں معلوم ہوتی ہیں جو اپنا ماضی ڈھونڈھتی پھر رہی ہوں۔

”ابا“ نے غفور میاں کے پاس ایک بھینس خرید کر چھوڑ رکھی ہے وہ معاوضے میں روزانہ تین یا دو دودھ ”ابا“ کو دیتا ہے اور نصف سیر دودھ کا ”ابا“ نے ان بوڑھیوں کے لیے بندوبست کر دیا ہے ایک دو سکر کی نظر بجا کر یہ بوڑھیاں کبھی کبھی اپنے حصے سے زیادہ دودھ پی جاتی ہیں اور پھر لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ دونوں ہی کے مرحوم شوہران کی اپنی قبروں سے اٹھائے جاتے ہیں پھر سلائے جاتے ہیں پھر اٹھائے جاتے ہیں۔ پھر دونوں ہی مل کر رونے کے لیے بیٹھ جاتی ہیں۔ لیکن دوسرے دن دودھ کا راتب ملنے سے پہلے دونوں شیر و شکر

ہو چکی ہوتی ہیں درابا کے دودھ میں سے پاؤ بھر دودھ نکال کر اتنا ہی پانی ملا دیتی ہیں۔
میرے فلیٹ کے بائیس ابا کا ایک اور قریبی رشتہ دار میجر رشید الدین خاں
رہتا ہے یہ غالباً ”ابا“ کے کسی مرحوم بھائی کی چیمینی بیٹی کا چھتا شوہر ہونے
کے ناطے ”ابا“ کو بھی پیارا ہے۔

ابا کو ویسے کالونی کا ہر فرد پیارا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کالونی
کسی بھی فرد کو ”ابا“ کے پیارا اور محبت کی ضرورت نہیں ہے اور جس چیز کی
ضرورت نہیں ہے وہ ابا جانتا ہے لیکن ”ابا“ اصولوں کا آدمی ہے وہ وقت
کے انتظار میں ہے تاکہ ان لوگوں کو وہ ساری چیزیں دیدے جن کی قیمت ان
کی نظروں میں ابا کے پیار سے کمین زیادہ ہے۔

میں تو آپ کو میجر رشید الدین خاں کے متعلق بتلا رہا تھا کہ ابانچ میں آدھکا
”ابا“ کی شخصیت ہی کچھ ایسی سن موہنی ہے کہ آپ کینڈل کالونی کا ذکر کریں تو
اس کالونی کے چپے چپے پر ابا بچھایا ہوا نظر آئے گا۔ گھر گھر میں ابا کی پہچائیں
دکھائی دے گی ”ابا“ کی جو مرکزیت ہے وہ کچھ اس طرح کی ہے کہ ابا کے جو
کو کینڈل کالونی سے ہٹا لیجیے تو اس ساری کالونی کے یقیناً پرچھے اڑ جائیں گے
اس کالونی کے حدود میں ایک آدمی دوسرے آدمی کی صورت بھی نہیں
پہچانے گا۔ کاغذ قلم اور برچھے بھالے لے کر لوگ کالونی کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے
اس کا بٹوارہ کر لینے کے لیے بھی ایک دوسرے پر بھڑکیں گے، کبھی عدالت کا دروازہ
کھٹ کھٹائیں گے۔ عدالت کے دروازے کی مماثلت سے ہی میں نے اس
ہنگامہ آرائی کی فضا میں کاغذ اور قلم کا بھی نام لیا ہے ورنہ کاغذ اور قلم کا یہاں

کیا کام۔ میں کہنا کیا چاہتا تھا کہ ابا کا وجود ہٹ جائے تو پھر اس انفرادی
 اس بعض نغاد اس آتش و بار دت کی فضا میں جہاں بھائی بھائی کو دیکھ کر
 مسخ پھیر لیتا ہے۔ جہاں خاندان کی بڑی بوڑھیاں کھنڈروں سے آئی ہوئی
 روجوں کی طرح اپنا ماضی تلاش کرتی پھرتی ہیں وہاں آدمی آدمی کو کس طرح
 پہچان سکتا ہے اور میرے کان آنے والے وقت کے وہ دھماکے سن رہے
 ہیں جب کینڈل کا لونی بالکل جوں کی توں دھری رہے گی لیکن وہ حرارت
 اس سے بچھن جائے گی جو زندگی کا دوسرا نام ہے اس میں پارک ہونے والی
 موٹریں اپنے اپنے لیمپ جلا کر ایک دوسرے کو گھوریں گی لیکن پہچان نہ پائیں
 گی کالونی کے کتے ایک جگہ جمع ہو کر کانفرنس کریں گے اور جب انھیں موت کے
 سے سنٹے ساری کالونی میں رہینگئے ہوئے نظر آئیں گے تو وہ انھیں سناٹوں
 سے بھوں بھوں کرتے زندگی کی بھیک مانگیں گے ابھی میری کینڈل کالونی کے
 ”آدمی باسیوں“ کو یہ نہیں معلوم ہے کہ ایک ”محبت“ کی موت ایک ”معاشرے“
 کی موت ہوتی ہے اور اسی موت و زندگی کے درمیان ابا کا وجود کج تک
 ایک ربط باہمی بنا ہوا ہے بالکل اسی طرح جیسے ساری کالونی کے ”آدمی باسی“
 کسی گہری گھاٹی کے اٹوٹ اندھیروں میں کالونی سمیت ڈوب جانے کے لیے
 اپنا سارا اندر باند لگا رہے ہوں صرف اس تصور میں کہ اس کھائی کی تہ
 میں جواہرات کی ڈھیریاں چھپی ہیں اور ابالے چارہ تین تنہا ساری کینڈل
 کالونی کو ایک مضبوط رسی میں باندھے کھائی کے کنارے کھڑا ہوا کالونی کو اوپر
 اٹھانے کے لیے آنکھیں بار بار اپنا سارا اندر اپنی ساری قوت لگا رہا ہے۔ لیکن

رسی ٹوٹ جانے کا ڈر ہے۔ مجھے ایک ڈر اور بھی ہے۔ رسی ٹوٹنے سے پہلے ہی اگر ابا کا سانس ٹوٹ جائے تو۔ اس لیے کہ وہ تین تنہا کنارے پر کھڑا لپ رہا ہے اور اس کے دست باز دشل ہو گئے ہیں۔ میں پھر کہاں سے کہاں نکل آیا ہوں۔ میں تو آپ سے میجر رشید الدین خاں کی بات کرنے چلا تھا میجر رشید الدین خاں کا لونی بھر میں سب سے مقبول ہے مرجان مرغ شخصیت کا مالک ہے آپ اس سے سوائے ادب کے کسی بھی عام موضوع پر بات کر سکتے ہیں۔ وہ کج کل مختلف قسم کا بزنس کرتا ہے آدمی تیز ہے زمانے کے سر درد گرم کا شعور رکھتا ہے کالونی کی پراپرٹی پراپرٹی پر اپنے معمول کی بنیادیں نہیں رکھتا۔ پولیس کچن کے بعد اس کو حیدر آباد کالجی سے علاحدہ کر دیا گیا تھا لیکن آج فوجی انسر کی کوئی نشانی اس میں باقی نہیں ہے۔ میں نے اتنا وسیع الملاقات آدمی کم ہی دیکھا ہے بھانت بھانت کے لوگ اس سے ملنے کے لیے آتے ہیں کسی کے ملنے جلنے والوں کو دیکھ کر اس کی اپنی انفرادیت کے تعلق سے کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے لیکن رشید الدین خاں کا معاملہ ہی دوسرا ہے اس لیے کہ اس کے پاس دوست اور اہل معاملہ کچھ ایک ہی ڈھب سے آتے ہیں تالی بگتی ہے اور میجر کھر کی سے سر نکال لیتا ہے ایک بار ایک رکشہ میں ماہی بے آب کی طرح ترہتی ہوئی ایک عورت میجر کے پاس لائی گئی تو میں حیران ہو گیا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد میں نے دیکھا کہ میجر چھری ہاتھ میں لیے سورج کی جانب رخ کیے آنکھیں بند کیے جھوم جھوم کر کچھ پڑھ رہا ہے اور چھری پر پھونک مار کر نہایت احتیاط سے عورت کے ننگے پیٹ پر چلیپ بنا رہا تھا جو بن نہیں رہے ہیں اس لیے کہ عورت

کا پیٹ کوئی کاغذ نہیں ہے اور میجر کی چھری بھی کوئی تلم نہیں ہے۔ لیکن وہ جوں جوں ایسا کرتا جا رہا ہے عورت کی تڑپ سکون سے بدل رہی ہے۔

میجر رشید الدین نے دوسری جنگ عظیم میں سنگاپور میں جاپانیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر جو زندگی گزاری ہے اس کی داستان جتنی طویل ہے اتنی ہی دردناک بھی ہے۔ فی الوقت اتنی بات ذہن میں رکھیے کہ میجر رشید الدین خاں جس کے چہرے کو دوسری جنگ عظیم نے مسخ کر رکھا ہے موت سے اس طرح آنکھیں ملاتا رہا ہے کہ موت ہمیشہ اس کے آگے نکل چکی رہی ہے۔

کینڈل کالونی کی خصوصیات کو آپ کے سامنے رکھنا میرے لیے بڑا مشکل مرحلہ ہے اس کالونی میں مجھے قدم قدم پر محبتیں ملی ہیں چھوٹوں سے بڑوں سے ہم عمروں سے لیکن اس کے باوجود ان انجبتوں کو محبت کہتے ہیں ڈرتا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ کینڈل کالونی میں ساری محبت کی عمر بھی ایک ساعت و دیدار سے کم ہوتی ہے جب کہ ایک ساعت دیدار اسی جہاں میں ساری عمر کی محبت ہو سکتی ہے لیکن میں ان مختصر ترین محبتوں کو ملول دینے کا گرجا جانتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ان محبتوں میں اگر کوئی شے نکلے ہے تو کینڈل کالونی خود ہے اپنی شتر کہ جائداد کی صورت میں یہ کالونی یہاں بسنے والے افراد خاندان کے دلوں میں ایسے انگلشن لگا رہی ہے جن سے محبتوں کے نشے اتر رہے ہیں آدمی کے اندر ڈھکے چھپے ایسے جذبے بیدار ہو رہے ہیں جو محبت کی عمر کو گھٹاتے ہیں اور اسے آہستہ آہستہ بڑے سلیقے سے قتل کر دیتے ہیں۔

ابا کا ایک چھوٹا بھائی ہے جسے کالونی کے اکثر لوگ چچا پکارتے ہیں ابا کے اور اس چچا کے درمیان کینڈل کالونی سے زیادہ حائل ہے ابا جس سمت دیکھتا ہے چچا اس سمت دیکھتا ہی نہیں اس لیے کہ اس مرکز پر چھبیس دونوں ایک ساتھ دیکھ رہے ہیں دونوں کی نظریں جالمتی ہیں لیکن چچا کی بیوی جسے کالونی کے سارے لوگ چچی نہیں پکارتے بڑی ہی سبھ دار اور طرہ دار عورت ہے ”ابا“ اور ”چچا“ کی مخالفتوں کے باوجود وہ بزرگ ہونے کے ناطے ابا کا بڑا احترام کرتی ہے۔ چچے اس کالونی میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگ ایک خوبصورت سے خان میں ہر سے کو سجا کر ابا کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تاکہ اس سجادے کے نیچے ابا کی نظر نہ جاسکیں۔ چچا کی بیوی جسے سب چچی نہیں کہتے کچھ اسی قسم کا رول دوسروں سے زیادہ ہی ابا سے ادا کرتی ہے۔

چچی کی بیٹی کا حسن کالونی کے باہر بھی دور دور مشہور ہے۔ اس شہرت میں سچ پوچھے تو چچی کی بیٹی کے حسن کو دخل کم ہے اور شخصیت کو زیادہ بعض شخصیتیں کچھ اس طرح حاذب توجہ ہوتی ہیں کہ انہیں دیکھتے رہنے میں آنکھوں کو بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ غور کیجئے تو ان میں وہ کشش ان کی غیر معمولی حسن کی بنا پر نہیں ہوتی جب کہ وہ اتنی حسین ہوں ہی نہیں سکتی چچی کی اس بیٹی کا حسن اس کی وضع داری اور پندار کے باعث نکھر رہا ہے وہ نظریں جو دنیا بھر کو دیکھ لینے کا جتن کرتی ہوں کہیں اپنی ”ننگہ“ کو بقول غالب بظاہر نگاہ ”بننے نہیں دیتیں۔“ کالونی کی حسیہ دلنواز کالونی کے ابا اور کالونی کے چچا یعنی اس کے اپنے ابا اور اس کے اپنے چچا کے نفاق کو بھی اسی نگاہ غلط انداز سے دیکھا کرتی ہے جیسے راہ میں پڑے طالب دیدار کو۔

”ابا“ کے وہ دن سنہرے دن تھے جن دنوں ”ابا“ کی چہیتی بیوی زندہ تھیں ابا کو اس ایک ہفتی میں دنیا بھر کی محبتیں مل گئی تھیں۔ اس معمولی شکل و صورت کی عورت نے واقعی کالونی بھر کے دلوں پر حکومت کی تھی ابا تو ظاہر ہے ایسے میں فاتح زمانہ تھا جس نے اس عورت کا دل جیت لیا تھا جس کے قہقہے میں اس کے ہر چھوٹے ٹپٹے ملنے والے کا دل تھا۔ لیکن جب اس عورت نے زندگی ہی سے ناٹھ توڑ لیا تو اس کے بے پناہ اشار و محبت نے ”ابا“ کے دیران دل میں محرمیوں کی ایک دنیا آباد کر دی۔ اور اب ابا ہر چھوٹی محبت کے پیچھے آنکھیں بند کیے دیوانہ وار دوڑتا نظر آتا ہے اور وہ ساری محبتیں جو کینڈل کالونی کی سونا گلنے والی جاں نداد کے سہارے آج تک جوں توں زندہ تھیں بیمار ہو کر آخری سانسیں لے رہی ہیں تو ”ابا“ بوکھلا گیا ہے وہ کالونی کے سناٹوں میں پازیکے پھنکا کوں کو سننا چاہتا ہے وہ دیرانیوں میں زندگی کی ہما ہی کا متلاشی ہے وہ کینڈل کالونی میں ایک ایسا دیا جلانے بیٹھا ہے جس کی جوت کالونی کے ہر رہنے والے کو دوسرے رہنے والے کے دل کا راستہ بتا سکے۔ لیکن لوگ اس جوت کے سہارے ایک دوسرے کے دل میں داخل ہونے کی بجائے ایک دوسرے کے دل سے نکل کر کالونی ہی میں جمع ہو رہے ہیں۔

جب کبھی ابا یہ دیکھ لیتا ہے کہ اس نے جو دیا جلا رکھا ہے اس کی لوائتنے سارے کالونی کے رہنے والوں کی یورش سے کانپ کانپ اٹھتی ہے تو وہ ان سبھوں کو ساتھ لے کر کینڈل کالونی ہی سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے سیر و تفریح کیلئے نئے نئے دل کش مقامات پر ان سب کو لے جاتا ہے بے دریغ خرچ کرتا ہے

ہنسی خوشی مسکراہٹیں، تمہقے، ترنگ، دلوے، غل غباڑہ، کھیل تماشے۔ کالونی کا چھوٹا بڑا ہر شخص جب اس کے اطراف خوش اور مطمئن ہوتا ہے تو ابا کے چہرے کا روپ دیدنی ہوتا ہے وہ سترپا ایک دیا بن جاتا ہے جس کی بتی تیل کے آخری قطرے کے سہارے جل رہی ہو۔ لیکن اپنی اس پل بھر کی روشن زندگی سے مطمئن ہو جس کے اطراف پر دانے رقصاں ہوں۔

”ابا کے بعد کینڈل کالونی کا جو کچھ ہو گا وہ تو میری نظر میں ہے
لیکن ”ابا“ کے بعد اس ابا کا کیا ہو گا جو کبھی نہیں مرے گا۔“

ایک روز میرا بدن شدید تپ سے پھنک رہا تھا ان دنوں گرمیاں شدید پڑ رہی تھیں۔ ابا میری عیادت کو آیا اپنے ایر کنڈیشنڈ روم سے نکل کر میرے فلیٹ آتے آتے اس کا چہرہ تازت سے دکھا کھٹا تھا۔ اس نے خیر خبریت پوچھی اور میرے پاس بیٹھ گیا تو میں نے پنکھا اس کے ہاتھ میں تھا دیا کہ وہ شدید گرمی کو نہیں۔ گرمی کے احساس کو دور کر سکے۔

کہنے لگا یہ فلیٹ تو بھٹی کی طرح پتا ہے اس فضا میں بھلا تم کیا تندرست ہو سکو گے۔

میں نے ازراہ مذاق کہہ دیا آپ ہی کا تو فلیٹ ہے ایک بجلی کا پنکھا یہاں بھی لگا رہے ہیں۔ ساری کالونی میں میرا ہی ایک فلیٹ ہے جو پنکھے سے محروم ہے۔ شام کو اس کا موٹر فلیٹ کے سامنے لگا تو وہ خود ٹیل فین اٹھاتے بیٹھتا تھا۔

اور کچھ ایسی پریشاں نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے پنکھا میرے

فلٹ میں نہیں بلکہ اسمگل کیا ہوا مال سرحد پار پہونچا رہا ہو۔
 لوٹنے لگا تو بڑی بجا جت سے مجھ سے کہنے لگا۔ کسی سے بتانا مست کہ یہ پنکھا
 میں نے تمہیں دلایا ہے۔

کیوں نہیں بتاؤں گا۔ یہ تو آپ کی عنایت ہے، میں نے اصرار کیا۔
 ”میرے لوگ برا مانستے ہیں۔“ وہ سکرایا۔ پنکھے پر صرف کی ہوئی
 رقم محفوظ رکھی جاتی تو میرے بعد کل تقسیم میں انھیں کس کام آتی۔
 ”سمجھے کچھ۔“



اندھیروں کی لاج

بخت افروز نہ جہاں ساری بیگیوں کی سرتاج تھیں۔ زمانے نے انھیں اور
 اکھوں نے زمانے کو اچھی طرح دیکھا اور پرکھا تھا۔ جہاں کے بہار کے دن تھے تو
 سارے شہر میں ان کا نام چلتا تھا۔ مدح و تنبی تھیں کہ بڑے بڑے نواب زادوں
 سے ذرا سی بات پر چشمکیں ہو جاتیں۔ بگڑ جاتیں تو منانے والے سو سو طرح سے ملتے
 انٹرمیاں نے صورت دی تھی۔ آواز دی تھی اور پھر بڑی بات یہ کہ ترکے میں دولت
 بھی خانی دی تھی۔ کسبیاں یوں تو شہر میں بہت سی تھیں۔ لیکن بخت افروز جہاں
 چوٹی کی طوائفوں میں بھی سمجھے جاتے کہ ماؤنٹ ایورسٹ تھیں جن کو کسی تین سٹکھیا لاری
 نے فتح نہیں کیا تھا۔

نواب اور نواب زادے افروز جہاں اور فیروز جہاں کے طائفے کی باتیں،
 بڑے تکبر سے کرتے۔ افروز جہاں اور فیروز جہاں دونوں بہنیں تھیں لیکن افروز جہاں

کی بات ہی کچھ ادر تھی۔ افروز جہاں سے اپنے معاشقے کی داستانیں سناتے پھرنا۔
 اہل ثروت کے لیے باعث فخر تھا۔ جہاں نواب زادوں نے افروز جہاں کے نام کے
 ساتھ کھوڑی بہت شہرت پائی تھی۔ ان کا معمول ہونا مسلم تھا وہ خود اس بات
 پر اترتے تھے کہ شہر کی سب سے بڑی طوائف کے خلوت کدہ کو انھوں نے اپنی بھری
 جوانی کی دولت سے مزین داراستہ کیا تھا۔

دو ایک جن کی زیادہ شہرت تھی ان کا عالم تو یہ تھا کہ کوکھوں سے گزرتے وقت
 نظر اٹھا کر کسی دوسری حسینہ کی طرف دیکھ لینا بھی خلاف شان سمجھتے تھے بستی پھر
 میں نظر میں اٹھتیں آہستہ آہستہ ہونٹ ملتے۔ پھر انگشت نمائی بھی ہوتی۔ آج کل
 افروز جہاں نواب صاحب پر بہت ہربان ہیں خدا خیر کرے۔ بھئی افروز جہاں
 کے نام لیوا ہیں۔ لکھو بستی تو ہوں گے ہی لیکن وہ دن دور نہیں ہے کہ چاک بک
 کے لیے آنکھیں ترس جائیں گی صاحبزادے کی۔ یار قسمت والا نکلا لوٹا سیتے
 ہیں اٹے نوازی ہے۔ واہ صاحب کس نے کہہ دیا ہے۔ اس کو بھلا کیا نواز
 گی۔ ابن فلاں ہے ابن فلاں۔ اور پھر جوانی بھی کیا نکالی ہے۔ افروز کی
 بیٹی ہوتی تو جوڑ تھا اس سے۔ عمر کا تفاوت بھی تو ایک چیز ہے۔ بس
 فدا ہو گئی ہوں گی افروز جہاں بھی۔ کس بے۔ جاہ و ثروت کی کمی نہیں ہے
 — ابن فلاں ہے۔ ابن فلاں —

لیکن افروز جہاں بھی لاکھوں میں ایک سمجھی جاتی تھیں۔ لاکھوں میں ایک
 نکلیں بھی۔ لکھ بستی سیٹھ ابن فلاں کو چھوڑ چھاڑ کر وہ بس ایک مفلس شاعر کی
 ہور ہیں۔ ادھر یہ سب کچھ اس تیزی سے ہوا کہ سارے عاشق بس دیکھتے دیکھتے

دہ گئے۔

راتوں کو افروز جہاں کے کوٹھے کا طواف کرنے والوں نے شاعر کے کینچ نقس کو کھوج نکالا۔ لیکن افروز جہاں بھی پانی کی عورت تھیں۔ بے پردگی گوارا نہ کی۔ کہلا بھیجا کہ جس افروز کے لیے آپ یہاں آئے ہیں، اس کو میں نے اپنے ہاتھوں ”ہندی محبوب“ میں دفن دیا ہے۔ اور جو بخت افروز جہاں اس چھوٹے سے مکان میں رہتی ہے اس کے پاس اس کا اپنا کچھ بھی نہیں ہے اب اس کا سب کچھ ملک کے مشہور شاعر تسکین سردی کی ملکیت ہے۔ اللہ بس باقی ہو۔

افروز جہاں سے ملنے والوں میں ہر درجہ کا عاشق تھا۔ ایسا عاشق بھی تھا جو بس تعلقات نبھا رہا تھا۔ افروز جہاں گھر بیٹھ گئیں تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور وہ آتا ہوا ہر کوٹھے کی چوکھٹ بھلا گئے گا۔ ایسا عاشق بھی تھا جو کسی صنوجا چڑیا کو حالت نشہ میں ”افروزی“ پکار کر ہی خوش ہو جاتا۔

ایک عاشق نے افروز کی یاد میں فیروز پر قناعت کر لی۔ لیکن فلاں ابن فلاں نے مشہور شاعر تسکین سردی کے گھر کا طواف نہ چھوڑا، اور ایک رات جب کہ شاعر دولت داد و تحسین سے مالا مال ہو کر ٹری رات کو ایک مشاعرے سے لوٹ رہا تھا عین گھر کے قریب لوگوں نے ایک دلروز چیخ سنی۔ چیخ سننے والے جب شاعر کے گھر کے قریب پہنچے تو انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ خون آلود لاش سے چمٹی ہوئی افروز جہاں گلی میں لوٹ رہی ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ، اس کا پہرہ، اس کے بال خون میں رنگ گئے ہیں۔ وہ عالم نیم بیہوشی میں مسلسل

بڑا بڑا رہی ہے۔ اپنے خون آلود ہاتھوں کو دیوانوں کی طرح غور سے دیکھ
 دیکھ کر چوم رہی تھی۔ یہ تمھارا خون ہے۔ تم بہت بلند ہو۔
 — تم عظیم ہو۔ یہ تمھارا خون ہے۔
 افروز جہاں بے ہوش ہو گئی۔

شاعر کو کس نے قتل کر دیا، یہ سارا آج تک راز ہی ہے۔ نواب صاحب
 بھی کچھ کم غمزدہ نہ رہے۔ کیوں کہ شاعر ان کا بھی دوست تھا۔ یہ ادبیات
 ہے کہ پولیس کے چند افسروں سے نواب صاحب کی تحلیف میں ملاقاتیں رہیں۔
 قریب قریب نواب صاحب کچھ کم ہی سکراسکے، پھر یکایک وہ بہت خوش
 رہنے لگے۔ ان کے چار ایسے مصاحب جو ہمیشہ نواب صاحب کی پیشانی میں
 رہتے تھے آہستہ آہستہ بھر ڈیوڑھی میں آنے لگے جو کچھ دلوں سے پتہ نہیں کہاں
 غائب رہتے۔

المشہد رکھے نواب صاحب کی ڈیوڑھی کی چیل پہل، ڈیوڑھی کی عظمت، ڈیوڑھی
 کی زندگی سب کچھ نواب صاحب ہی کے دم قدم سے تھی۔ شاعر کے قتل کے
 بعد وہ کیا اداس ہوئے کہ ساری ڈیوڑھی پر اداسیاں سلط ہو گئیں۔ اب
 وہ مسکرا رہے تھے تو ساری ڈیوڑھی کھلکھلا رہی تھی۔

شہزادی بیگم بڑے گھر کی بیٹی تھیں۔ اطلس کو ٹاٹ کا پیوند تو لگانا تھا جو نواب
 صاحب دوسری بیگم کی طرح شہزادی کو بھی اس طرح نظروں سے گرا دیتے
 جس طرح وہ دل سے دور ہو گئی تھیں دل کی بات اور تھی دل ہی تھا، اور
 وہ بھی نواب صاحب کا۔ اس نگری میں، اس بستی میں جو بس جاتا۔ بس

جاتا۔ اور جس کے لیے اس نگری کے دروازے بند ہو جاتے تو پھر نہ کھلتے۔
 لیکن شہزادی بیگم کو دل سے دور کرنے کے بعد ان سے نظر میں بھی پھیر لینا نواب
 صاحب کے بس کی بات نہ تھی حالاں کہ وہ دل ہی دل میں شہزادی بیگم سے نفرت
 کرنے لگے تھے۔ لیکن شہزادی نہ صرف نواب صاحب کی پہلی بیوی ہی تھیں
 بلکہ اسی گھر کی بیٹی بھی تھیں۔ باجے، بارات، جلوے، مانجے سے آئی تھیں۔
 دوسری بیگم کا نواب صاحب نے ہاتھ پکڑ لیا تو وہ سر پر آ بیٹھیں۔ ہاتھ چھوڑ
 دیا تو بکھی ہوئی مسندوں کو لپیٹ سمیٹ کر نہایت احتیاط سے ہر ایک نے
 اپنے دل کے نہاں خانے میں انھیں چھپا رکھا۔

شہزادی کا ہاتھ نہ تو نواب صاحب نے تھاما تھا اور نہ ان کے بس میں
 تھا کہ اس ہاتھ کو بے دردی سے جھٹک دیتے۔ مرحوم نواب برکت جنگ نے
 بہو کا ہاتھ بیٹے کے ہاتھ میں دے کر جنم جنم کے لیے شیر و شکر رہنے کی قسمیں
 دی تھیں کیوں کہ بہو شہزادی ان کے بہت چہیتے مرحوم بھائی نواب صلابت
 علی خاں کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ نواب صلابت علی خاں تھے بھی بڑے خوبیوں
 کے مالک۔ خاندان بھر میں کوئی بھی ایسا شخص نہ تھا جو ان کا شاکی ہو۔ سب
 ان کی تعریفیں کرتے۔ بہت منکسر المزاج، خلیق اطیع مرخیاں مراہج، ہمیشہ
 پان کی خوشبودار پیک سے بانچھیں سرخیوں میں بھگی رہتیں۔ کبھی کسی نے جبین
 بر جبین نہیں دیکھا۔ اور موت تھی تو کس قدر اندوہناک تھی ان کی۔ برکت
 جنگ مرحوم کے دل پر جیسے بجلی گزرتی تھی۔ جب سقط بن مبروک دارودعہ
 اصطبل نے گھوڑے پر آکر خبر دی کہ صلابت جنگ نہ رہے۔ اور جب

وہ مرے ہیں اس وقت صلابت جنگ بھی کہاں تھے وہ صرف نواب صلابت علی خاں تھے۔ بعد میں برکت جنگ کو معلوم ہوا تھا کہ حاکم وقت نے جنگ کے خطاب سے انھیں سرفراز کیا تھا۔

اپنی زندگی میں نواب صلابت علی خاں نے یہ خوش خبری بھی نہ سنی تھی کتنی خواہش تھی کہ وہ بڑے بھائی کی طرح جنگ کے خطاب سے نوازے جائیں اور باپ دادا کا نام بردار کرنے میں ان کا بھی حصہ رہے لیکن محرومیاں ان کا مقدر تھیں۔ ڈاڑھی اور سفید بالوں پر خضاب چڑھا کر واقعی جوان معلوم ہوتے، صحت بھی خاصی تھی۔ خدا بھلا کرے اس حکیم کا جس نے ان کی جان لی۔ چھپے چوری عقد ہوا۔ سند سے ابھی اٹھے بھی نہ تھے کہ پیشاب سند ہی پر خطا ہو گیا اور دیکھتے کے دیکھتے وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ بیٹی کی عمر اٹھارہ سالہ نوجوان لڑکی جس لمحے ان کی بیوی بنی تھی، اسی لمحے بیوہ بھی ہو گئی۔ یہ محرومیاں بھی وہ اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ قصور حکیم صاحب کا نہیں بلکہ خود مرحوم کا تھا کہ انھوں نے کشتے کی زیادہ مقدار استعمال کر لی جو ان کے حق میں تریاق کی بجائے سم قاتل ہو گیا۔ نہ ہر بلا اہل ہو گیا۔

برکت جنگ نے اپنے مرحوم بھائی کا پیار بھی اپنی بھتیجی کے لیے مختص کر دیا بلا شرکت غیرے شہزادی بیگم چچا ابا کے اقلیم دل کی فاتح بن بیٹھیں۔ بڑے چاؤ سے اور بڑے لاڈ پیار سے جب اس قابل ہوئیں تو مرحوم برکت جنگ نے اپنے ہی فرزند ارجمند نواب صاحب کے ہاتھ میں شہزادی بیگم کا ہاتھ

تھما دیا، اور یہ سب کچھ بہت دھوم دھڑاکے سے ہوا، بڑے کدو فر سے ہوا۔
 شہزادی بیگم اس طرح نواب صاحب کے پسلی کا جوڑا تھیں۔ آتے کے آتے اس
 بری طرح نواب صاحب پر چھا گئی تھیں کہ انہماک شکل ہے اب کس طرح کوئی یہ
 بتا دے کہ نواب صاحب چوروں کی طرح ڈیوڑھی میں پھپھتے پھرتے۔ رات کو گیارہ
 بجے سے پہلے ڈیوڑھی میں واپس نہ آجاتے تو پھر رات بھر نہ آسکتے اور اگر آنا
 اتنا ضروری ہوتا تو گیٹ پھلانگ کر آتے، دیوار کو دکر آتے، کسی ملازم کی ہمت
 نہ تھی کہ یہ جانتے ہوئے بھی باہر کھڑا کھڑا آہستہ آہستہ گیٹ پر ٹھپ ٹھپ کرنے والا
 اس ڈیوڑھی کا مالک ہے، اس کا آقا سیٹے انھیں گیٹ کھولی کر اندر بلا لیتا۔ گیٹ
 کی دراندہی سے کوئی سرکوشیاں کرتا۔

سرکار (علی جاگ رہی ہیں پائیں باغ کے پچھلے دروازے کو بھی قفل ڈلوادیا ہے۔
 فانوس ابھی گل نہیں ہوئے خزانہ گیٹ سے آنا، نامناسب ہے، تو کیا

پچھلی دیوار ہی سے چلا آؤں ۹۔

جی ہاں خزانہ۔ مسقط بن مبروک بھی سرکار کے انتظار میں رہیں بیٹھے ہیں
 غلام زادے کو یہاں متعین کر رکھا ہے۔ اور نواب چور راستوں سے مسقط بن مبروک
 کے سہارے ڈیوڑھی میں داخل ہو جاتے۔

گھر کا آقا بھیکلی بلی بنا شہزادی کے آگے سہم سہم جاتا۔ پھر دوسرے کس شمار
 میں تھے۔ شہزادی کی ایک آواز نکلتی تو ہر چھوٹے بڑے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے
 نواب صاحب کے آگے اس کی شکایت کر دیتیں تو اس سے پہلے کہ ان کا شکایتی
 جملہ پورا ہوتا نواب صاحب جرم مانے، معطلی اور برطرفی کے احکام صادر کرنا شروع

کر دیتے۔ شہزادی کی ہنسی سے اس آدمی کو فوری ہٹایا جاتا اور کسی دوسرے کو متعین کر کے انھیں باور کر دیا جاتا کہ معطلی کا عمل کر دیا گیا ہے۔

بڑے نواب صاحب کی زندگی تک شہزادی بیگم نے جو چاہا کیا۔ نواب صاحب جب شہزادی سے تنگ آچکے تو انھوں نے بڑے نواب صاحب کے کانوں پر ڈلوایا کہ وہ کہہ سن کر شہزادی کے روئیے کو بدلنے میں مدد کریں۔

مدد تو خیر انھوں نے کچھ نہ کی۔ اگلے شہزادی کو معلوم ہوا تو وہ درانی ہوئی بنگلے پر چھا رہا کہ پاس چلی گئیں۔ قدموں سے چپٹ کر اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے اور بین کر کے نواب صاحب کی بے رنجی کا وہ ردنا رو دیا کہ اگلے نواب صاحب کو اپنا رویہ بدلنے کے لیے نواب صاحب مرحوم نے کافی سے زیادہ نصیحت کی۔ نواب صاحب اس تو تو، میں میں سے تنگ آچکے تو انھوں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ رات بڑی ہو تو صبح بھی ڈیوڑھی کے باہر ہی ہو،

یہ دن نواب صاحب کی جوانی کے دن تھے۔۔۔ افروز جہاں پر اس قدر فوار شیں تھیں کہ نواب صاحب دن بھر میں کسی وقت جب تک ان سے نہ مل لیتے سکھ سے نہ رہتے۔ ڈیوڑھی سے اٹھ کر چپ چاپ نکل جاتے۔۔۔ مصاحبین ہی ہی عالم ہا کتے رہتے۔۔۔ شہزادی کو خبر لھی نہ ہوتی کہ دن کے اجالے میں لھی نواب صاحب اپنی داشتہ کا منہ چاٹ آئے ہیں۔

دوسروں کی نواب صاحب کو فکر نہ تھی لیکن بخت افروز جہاں کو وہ ڈیوڑھی ہی کے کسی حصے میں رکھ لینا چاہتے تھے۔ بہت جبارت کر کے وہ ایک بار مسقط بن مبروک کی مدد سے افروز جہاں کو ڈیوڑھی میں لے آئے۔ بائبریری سے قصل جو حمام

کھا اس میں اپنی افزوز کو چھپا کر کھا۔ ساتھ کھاتے، ساتھ پیئے، ساتھ ساتھ بیٹھے
 اٹھتے تھے۔ مشکل سے چار دن گزرے ہوں گے، گیلے بدن پر چادر لپیٹ کر اداسی
 حالت میں اوپر سے برقعہ اوڑھ کر افزوزی اپ بھپ کر تیں ڈیوڑھی سے نکل
 گئیں۔ تو ال میں جسم کو لپیٹ کر نواب صاحب نے جھٹ سے دروازہ کھولا
 تو شہزادی مسلسل دروازہ پیٹ رہی تھیں۔ پٹاخ سے دروازہ کھلتے ہی گرتے
 گرتے پکپک۔ نواب صاحب نے بو کھلا کر شہزادی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔
 کہنے لگے، شہزادی تمہیں کون غیر غلط یاد رکھا ہے، بھلا میں اس حرام میں کسی
 عورت کو لاسکتا ہوں۔ ابا حضور مجھے زندہ بھوڑ میں گئے بھلا۔ اور پھر ڈیوڑھی
 کے سامنے احاطے میں کسی کی مجال ہو سکتی ہے جو تمہاری حکمرانی میں مدد دے۔
 یہ کہتے کہتے نواب صاحب نے غسل خانے کو پھر بند کر لیا، اور چٹخنی چڑھائی۔
 کچھ دیر کے بعد جب شہزادی باہر نکلیں تو وہ کچھ خوش تھیں لیکن اس کے بعد
 افزوزی کو ڈیوڑھی میں لے آنے کی نواب صاحب نے کبھی اجازت نہ کی۔
 ان سے ہمدردی نہ ہو تو پھر کیا ہو گا جس کے بس میں سب کچھ ہو وہ خود
 ہی کچھ نہ دے تو اس سے بڑھ کر مجبوری کیا ہو سکتی ہے۔ پھر ایک جان زندگی
 کے کھٹے بے شمار۔ بخت افزوز جہاں کے اپنے گھر سے اٹھ کر نواب صاحب
 کے حرم میں داخل ہونے تک کسی کو کیا اندازہ ہو سکتا ہے کہ دولت کس طرح پانی
 بن کر بہتی رہی، خیر صاحب دل ہی کا تو معاملہ تھا کوئی مذاق تو تھا نہیں۔ بڑے بڑے
 راجے ہمارے لاکھوں کا خون کر کے ایک رنج زمین کے ٹکڑے کے لیے اپنی جان
 گنوا بیٹھے ہیں تو ان کے نام تاریخ میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ نواب نے کیا

برائی کی۔ یہاں تو بخت افروز جہاں کے اقلیم دل کو فتح کرنا تھا، کوئی اپرخ
 بھر زمین تو کھتی نہیں۔ اور پھر ایک شاعر ہی کی تو جان گئی نا۔ لاکھوں آدمی
 تو نہیں مرے۔ لیکن یہ شاعر کی مخلوق بھی کچھ عجیب و غریب تھی۔ یہ نہیں
 اس کا خون اتنا سرخ کیوں تھا۔ زمانے بھر کی سرخیاں جیسے اسی کے خون کا
 عیون بن گئی تھیں۔ پھیپائے نہ پھیپتا۔ زبان خنجر اور آستین کے لمبویں
 کوئی سار باز ہی نہ ہو پاتی جو کوئی چپ رہتا یہاں دونوں ہی مل کر پکارتے،
 اور اتنی قوت سے کہ نواب صاحب سوتے جاگتے یہی آواز میں سنتے۔ اور
 جب یہ آوازیں کم ہوئیں تو نواب صاحب کی ہیرے کی آخری انگوٹھی بھی بک
 چکی تھی۔ لیکن یہ بات اس طرح کھلے بندوں کہنے کی نہیں ہے۔ اس لیے کہ
 ان کے متول پہ حرف آتا ہے۔ وہ لاکھ بے حال سہی لیکن ان کے اپنے ذمے
 کے لوگ تو ان کے متول کے سہارے کچھ اور جینا چاہیں گے۔ جو تجوری میں بند
 تھا۔ یہ اور بات ہے کہ تجوری کا متول تجوری میں مقفل رہتا۔ وقت پر
 کام آتا اس کا کام نہ تھا لیکن اس کی افادیت سے بھی تو نہیں انکار کر سکتے
 ۔ اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی کہ نواب صاحب کے متول کی گاڑی اسی
 مقفل تجوری کے سہارے چلتی۔

جب سقط بن مبرک نے انتہائی راز میں نواب صاحب سے کہا تھا کہ تجوری
 میں ایک دمڑی بھی اب باقی نہیں ہے تو نواب صاحب کچھ دیر خلاؤں میں
 گھومتے رہے پھر آہستہ سے سقط کے کنارے پر ہلکے رکھ کر فرمایا کہ سقط
 تجوری کے پہرے پر ایک مسلح عرب کا اضافہ کر دو۔ دوسرے دن ڈیوڑھی

کے احاطہ میں لوگوں نے ایک دوسرے سے کالوں میں کہا کہ — پہرے
 داندوں میں اضافہ کر دیا گیا ہے — کچھ ہو آخر ہاتھ ہی تو سبے سرنگا
 بھی تو گزروں ہی سے اٹھنے لگا — اور ہاتھ گزروں سے نہیں انجوں سے
 اٹھتا رہا — بخت افروز جہاں کے اپنے گھر سے نواب صاحب کی
 ماڈیوڈھی میں منتقل ہونے تک پر سچ بچھے تو نواب صاحب کی نوابی صرت
 نام کو رہ گئی تھی۔ لیکن بخت افروز جہاں کو ان کی نوابی سے کچھ سروکار
 بھی تو نہ تھا، اپنا زندگی کا سارا حسن وہ شاعر ہی کے ساتھ دفنا چکی تھیں
 انھیں اس بات کا بھی بھگٹے منہ علم ہو جاتا کہ ان کی بھوٹی فسی حسین دنیا کو
 تاراج کرنے میں نواب صاحب کا بھی ہاتھ ہے تو وہ کسی قیمت نواب صاحب
 کو معاف نہ کرتیں۔

غم کے گھٹنے بادل جب چھٹ گئے تو افروزی نے سوچا یہ بادل تو ان کا
 مقدور ہیں۔ زندگی پھر اسی طرح امنڈ امنڈ کر اٹھیں گے اور ٹوٹ ٹوٹ
 کر برسیں گے کیوں کہ نہ کسی چھتار کے پیچھے سر بھپا کر زندگی کے باقی دن
 جوں توں کاٹ لیں۔ سو وہ نواب صاحب کے پاس اٹھ آئیں۔ اور اپنی
 ساری دولت اپنی بہن کو سوپ دی لیکن جلد ہی انھوں نے محسوس کیا کہ جب
 وہ اپنا بچھوٹا سا گھر چھوڑ کر نواب صاحب کے پاس آ رہی تھیں تو شاید بچھے
 چوری سارے بادل ان کے چوڑے چٹکے سینے میں گھس آئے اور بڑے
 اطمینان سے وہیں براجمان ہو گئے۔ — باہر کڑی دھوپ پڑتی تھی
 چٹکے، چاندنی نکھرتی لیکن افروز جہاں کے سینے میں جیسے دن رات سینہ

برتا رہتا۔ گھٹائیں چھائی رہتیں۔ جیسے زمانے بھر کی برساتیں ان کے سینے میں چھپ گئی ہوں۔

نواب صاحب طرح طرح اپنی افروز جہاں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔ ہلکا سا تبسم بھی انھیں بارغ باغ کر دیتا لیکن جیسے وہ افروزی جس سے نواب صاحب کو ٹھکے پر ملتے رہے تھے پتہ نہیں کہاں بجا بھیجی تھی۔ نواب صاحب اسی افروزی کو اب بھی افروز جہاں میں تلاش کرتے رہتے جو انھیں نہ ملتی۔

بریز آت پیرس، ہمارا فی بھانسی اور لارڈ ڈیل سن کی اب کی بار بہت شہرت تھی۔ ان کے کارناموں کے تذکرہ سے تو ساری کی ساری تاریخ بھری پڑی تھی۔ لارڈ ڈیل سن پر نواب صاحب بے طرح فریفتہ ہو گئے۔ ۱۹۵۳ء سے لے کر آج تک کسی نہ کسی دوران میں کوئی نہ کوئی کارنامہ اس نے ضرور انجام دیا تھا اور پھر ٹرینر سے لے کر لیدر اٹھانے والے تک سب کے سب خاندانی تھے۔ نواب صاحب کو معلوم تھا کہ لارڈ ڈیل سن کے خون میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہے۔ بریز آت پیرس ان کا گیس (dog) نہیں تھا۔ اعظم الشان جنگ کے اصرار پر انھوں نے فرسٹ میں شامل کر لیا تھا۔ ہاں البتہ ہمارا فی بھانسی نواب صاحب کے دل کا چوسنی ہوئی تھی۔ تیسری دوڑ میں ہمارا فی بھانسی سو فیصد ایکٹوڈ تھی۔ ہمارا فی کے متعلق یہ شہرت عام تھی کہ ڈارٹ ڈفرنش آتی ہے۔

نواب صاحب نے سیم بدری و شمال کو تخیل میں طلب کیا تو پھر ہی دیر بعد خوش و خرم باہر نکلے سیم ڈیریاں اترتے ہوئے بھک کر کورنش بجا لایا۔

پھر سیدھے ہوتے ہوئے کچھ اس طرح ڈکار لی جیسے نواب صاحب بڑی مشکل سے ہضم ہو رہے ہوں۔ لیکن اس سے پہلے کہ سیٹھ بدری دشاں اپنے تانگے میں سوار ہو جا نواب صاحب نے کڑک کر کچھ زیادہ ہی گرجا آواز میں مسقط بن مبروک کو حکم دیا کہ بمبئی کے سفر کی تیاری کرے اور پاس بلا کر کچھ اتنے ہی رازدارانہ انداز میں کہا کہ خود مسقط بن مبروک کے دوسرے مکان نے کچھ بھی نہ سنا۔ یہ ظاہر اتنی رازداری کی کوئی وجہ نہ تھی۔ بخت افروز نہاں کو نواب صاحب اپنے ساتھ بمبئی لیے جا رہے تھے۔ لیکن یہی معمولی سی بات شہزادی بیگم کے کان تک پہنچی تو بات بہت بڑھ سکتی تھی۔ اسی لیے نواب صاحب نے اس انداز سے اظہار کیا کہ خود مسقط بن مبروک کا دوسرا کان بھی محروم ہی رہا ہو گا۔

نواب صاحب کو بمبئی گئے بمشکل چار دن گزے ہوں گے کہ مسقط بن مبروک کو ٹینی گرام موصول ہوا۔ لو کی ایک ایک بوند نواب صاحب کی رہین منت تھی پھر مسقط بن مبروک عرب تھے۔ عرب بھی ایسے کہ جن کی شر یا توں میں حیدر آباد کا خون بھی شامل ہو گیا تھا، لیکن مسقط بن مبروک کو اس بات پر فخر تھا۔ جب کہ دوسرے عرب اس بات کو اہانت آمیز سمجھتے تھے۔ ٹیلی گرام ملا تو وہ بے چین ہو گئے۔

بدری دشاں نے اب کی بار صاف انکار کر دیا۔ وہ تو برسوں کی یاری آج کام آگئی ورنہ کیا ہوتا۔ صیقل خان ریلہ نے مسقط بن مبروک کی پیٹھ ٹھونکی اور چپکے سے سوسو کے باج کر ڈک ٹوٹ اس کے ہاتھ میں تھا دیے۔ مسقط بن مبروک کو ادھر لوگوں نے صیقل خان سے بغل گیر ہوتا ہوا دیکھا۔ ادھر دوسرے ہی لمحے وہ پوٹل آڈر کی کمیل کر دے بعض لوگوں کو پوسٹ آفس میں نظر آئے۔ بھی ٹک کا

پاس ہو تو اس طرح ہو کہ رقم نواب صاحب کے پاس بھجوا چکے تو کس قدر باغ باغ
 تھے مسقط بن میردک۔ جیسے سے باہر ہو رہے تھے پھولے نہ سماتے تھے۔
 راستے میں شہران پوٹل کے ”باہر والے“ نے جھک کر سلام کیا تو رکشا میں بیٹھ
 بیٹھے ہی انھوں نے آواز دی کہ چوکینا جلدی سے بڑھ کر ”دور پونے میں ایک کھڑا
 چمچہ۔“ چائے آگئی تو ”کھڑا چمچہ“ مسقط بن میردک نے خود سنبھالا اور دوسری
 پیالی کی طرف اشارہ کر کے چیت سے کہا: ”پی لو، عیش کرو۔“

ادھر چو نے عیش کیا، ادھر نواب صاحب نے۔ بمبئی سے لوٹے ہیں تو
 سگار کا ڈبہ تک خالی تھا۔ ہاں بخت افزہ جہاں کے سرخ ہونٹوں پر تبسم بھی تھا
 اور ٹھکے ہوئے بدن پر نیکی اور مادرن ساری تھی۔

جب مسقط بن میردک نے شہزادی سے دست بستہ عرض کیا کہ ”سن برادر
 امر تسری پیادل کے پیکٹ اب بازار بھر میں نہیں مل رہے ہیں تو بھلا وہ کس طرح
 سمجھ سکتی تھیں کہ حکومت نے جاگیریں ضبط کرنے کی کارروائی مکمل کر لی تھی اور یکم
 بازار کے سب سے بڑے بینے نے غلہ حسب معمول قرض دینے سے انکار کر دیا تھا۔
 پیادل کی بوریاں گودام میں رکھوائے ہوئے مسقط بن میردک حسب عادت
 سکرانے کی کوشش کر رہے تھے اور فتوہ بادرجن سے چھیڑ چھاڑ بھی جاری تھی، لیکن بغور
 دیکھنے سے کسی بھی صاحب نظر کو اس امر کا اندازہ ہو سکتا تھا کہ ان کی مسکراہٹیں
 ان کی تنگ کو جھٹلا رہی ہیں۔ ان کی چہل ان کی اداسیوں کی غمازی کر رہی ہے
 جو درد نواب صاحب کے دل میں جاگزیں ہو گیا تھا۔ وہی کرب مسقط بن میردک
 کے حصے میں آتا بھی اسی طرح ضروری تھا کہ نواب صاحب کی خوشی میں ان کی خوشی

جھوٹ موٹ اعلان کر رہی ہے جاگیرداروں کے نام سے۔ لیکن مسقط بن بکر کو اڑنی چڑیوں کے پر گنتے کافی بھی آتا تھا۔ جب بنیہ نے انکار کیا کہ اس ماہ امرتسری چادل کے پکیٹ تو رہے ایک طرف، کوئی ٹھیک سا باریک چادل بھی اس گودام میں نہیں ہے تو وہ فوری سمجھ گئے کہ دراصل وہ ان سے پوچھ رہا ہے کہ جو چکر اب تک تم اور تمھارے نواب صاحب کھاپ چکے تھے، اس کی ادائیگی کے لیے سیز دیپٹے اور ڈھی ہوئی وہ اہیلی زمینیں کہاں سے آئیں گی جن کو تم جاگیر کہتے تھے۔ اور اس کے بعد یہ سوال بہت ساروں نے دہرایا جن میں سیٹھ بدری و شال بھی شامل تھے۔ جان کلفٹن بھی اور سیفل خاں مردہلہ بھی۔

پچھلی رات تک جس دیوان خانے میں فانوس جلتی تھی آج اس کی چھت پر لمبی لمبی سچیں اس طرح لٹک رہی تھیں جیسے پھولوں سے بھرے ہوئے پودوں کو نوچ کر نکا کر دیا گیا ہو مسقط بن مہر وک کی طلبی ہوئی تو وہ ددڑ گئے کہ شہزادی آج چل قدرتی کے لیے نکلی تھیں۔ دیوان خانے سے ہو کر گزری ہیں۔ جو دیکھا ہے وہ بچھیں گی ہی۔ اور جواب ان کے ذہن میں محفوظ تھا۔ آداب بجالا کر انھوں نے ابھی گر دن بھی نہیں اٹھائی تھی کہ شہزادی نے بوچھا۔ مسقط ابھی تہینہ بھر بھی تو نہیں ہوا کہ سارے فانوس تیزاب سے دھلو کر صاف کر دائے گئے تھے۔ پھر کیوں صفائی کی ضرورت پیش آئی۔ مسقط نے کہا کہ کسی نے حضور کو غیر غلط یاد رکرایا ہے پھر صفائی ہو رہی ہے۔

تو کیا ہوا میں تھیں جو گئے ہیں یا غنا ہو گئے ہیں؟

مسقط بن مہر وک سمجھ گئے کہ نیم صاحبہ آہستہ آہستہ غصے میں آ رہی ہیں۔ ان کے

غصے کے ڈھنگ بھی نرا تھے، غصے کے عالم میں بھی آدمی کو دیکھ کر اس کی ہمتی کے مطابق الفاظ استعمال کرتیں۔ گھر کی باورچی یا کاماٹن پر برہم ہوتیں تو بے حجابا گالیاں بکے جاتیں۔ مسقط بن مبروک پر غصہ کرتیں تو اتنا ضرور ہوتا کہ مفاظا سے اس کو نہ نواہتیں لیکن گھٹی کا دودھ یا دولا آتیں ضرور۔ اب بیگم صاحبہ نے لفظ عفا استعمال کیا تو مسقط بن مبروک سمجھ گئے کہ انھوں نے اپنی دانست میں موٹی گالی دی ہے۔

تھٹ سے عرض کیا کہ حضور شاہ جمال صاحب جو روح القدس کی درگاہ کے بڑے سجادے ہیں سارے کے سارے فافوس پر دانگی پراٹھائے گئے ہیں۔
 ”کیوں بھلا؟“

”درگاہ کا عرس ہے نا خداوند۔“

”عرس تو ہر سال ہوتا ہوگا۔“

”اب کی بہت دھوم دھام سے کر رہے ہیں حضور۔“

”ہمیں اطلاع دیے بغیر اجازت دی کس نے؟“

”سرکار جلدی میں تھے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ شہزادی کے گوش گزار کر دوں۔“

”لیکن تم خود اس گھر کے مالک بن بیٹھے ہو۔ تم نے مجھے اس قابل نہیں

سمجھا ہوگا کہ مجھ سے اجازت لیتے۔ ذرا آنے تو دو تمھارے سرکار کو۔“

”خداوند، خداوند۔“

لیکن شہزادی نے ایک نہ سنی۔

مسقط بن مبروک بار بار اپنی صندوقی کے جیب کو اپنے ہاتھ سے جھوکر چسپے

سے دیکھ لیتے تھے جیسے جیب میں سوہن سے رکھے ہوئے نوٹ ساری سازشوں کا
بھانڈا چھوڑ دیں گے جو ابھی ابھی آکشن ہال کا مینجر فانوس کی قیمت کی صورت میں
ادا کر گیا تھا۔

شہزادی بیگم آخر تک سہر پٹیتیں۔۔۔ غصہ ہوا نفرت ہو یا محبت ہر حال
کے ساتھ ہر جذبے میں ٹھہراؤ آنا ضروری تھا۔۔۔ وہ آواز جو ڈیوڑھی بھر کے دل
دہلا دیتی تھی، اور جو ذواب صاحب کے چوڑے چکلے سینے میں بھی اٹھل پھٹل مچا دیتی
تھیں اب خود اپنے ہی تیروں سے محروم ہو کر جیسے ڈیوڑھی کے ہر کونے میں بے آسرا
بھٹکتی رہتی۔۔۔ یا سمن بوا، رپ بھپ کر تیں، ڈیوڑھی بھر میں گشت لگاتی پھرتیں
۔۔۔ پچھے چوری پھر دک بن سقط کے ہاتھوں جو تیریلیاں آئے دن ڈیوڑھی میں پور
تھیں ان پر نظر رکھتیں اور کھنڈی سانئیں بھر کر شہزادی بیگم تک ساری باتیں پہنچا
دیتیں۔

نوج غسل خانے کے سنگ مرمر بھی اکھڑ چکے ہیں شہزادی۔

غور لہیریری کے بک شلف اور کتابیں سقط بن مبروک لاری میں ڈال کر لے گیا
ہے کہیں۔

شہزادی محسوس کرتیں کہ ڈیوڑھی میں بھائیں بھائیں کرتے اندھیرے چاروں طرف
کسے کسے رہے ہیں۔ یا سمن بوا نہ ہوتیں تو یہ اندھیرے اس قدر تیری سے ڈیوڑھی
بھر پر قبضہ کر لیتے کہ ہاتھ کو ہاتھ سمجھانی دینا مشکل ہو جاتا۔۔۔ یا سمن بوا کا دم
تھا کہ وہ ہر اندھیرے کے قافلے کے دبے پاؤں آمد کا پتہ تو دیتی تھیں۔۔۔ ان کے
توسط سے شہزادی کے کافر تک یہ بات پہنچ چکی تھی کہ ان ساری تباہیوں کے ذمہ دار

نواب صاحب نہیں بلکہ نئی حکومت ہے۔ جو دھاندلی مچا کر جاگیریں ضبط کر چکی ہے۔
 رہ گیا اسیں، جو اادرہ شراب کا خرچ سودہ اتنا کہاں ہوتا ہے جو گھر کی چیزیں بازا میں
 نیلام ہوں۔ جن ہاتھوں میں پہونچتے پہونچتے ہزاروں کے نوٹ پانی بن کر بہہ
 جاتے تھے وہ ہاتھ ابیسی بھٹی بند کر لیں تو کبھی بہتی مایا منجھو ہو کر رہ بھٹوڑی جائے گی۔
 لیکن یا سمن بو اچھا اس انداز سے نواب صاحب کی ہمدردی کرتیں جیسے شہزادی
 کو جھنجھوڑ رہی ہوں کہ نواب صاحب کی ڈھیلی ڈوری کو ذرا کھینچنا نہ جائے تو خود
 زور لگا کر ساری ڈیوڑھی کو بازو میں کھینچ لیں گے اور شہزادی بیگم خود ان سے یا سمن
 بوا کی ہمدردی کے دہ پردہ جذبے کو زور و زدن کی طرح پکین جھپکا جھپکا کر دیکھ لیتیں
 ۔۔۔ لیکن بات احساس کی حدود سے دور جا چکی تھی۔۔۔ شہزادی بیگم خود بھی تو
 وقت کی بنص پر ہاتھ رکھنے کا اندازہ جانتی تھیں۔۔۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ سادی
 ڈیوڑھی کو بازو میں جانے سے بچانے کے لیے اس ڈوری کو کھینچنے کی ضرورت ہے
 جس کا ایک سر نواب صاحب کے ہاتھ میں تھا لیکن دوسرا سر شہزادی کے ہاتھ
 سے نکل چکا تھا۔۔۔ اب تو ان گھپ اندھیروں میں ڈوری کے اس سرے کو تلاش
 کرنے تک پتہ نہیں نہ ندگی کہاں سے کہاں تک پہونچ جائے۔۔۔

ڈیوڑھی کا پھاٹک بند ہو جانے پر دبے پاؤں دیوار پھیلانگ کر خود اپنے گھر
 میں چوروں کی طرح داخل ہونے والا اب چار چار دن ڈیوڑھی کا رخ بھی نہ کرتا
 تھا۔ شہزادی بیگم خود اپنی ہی آگ میں کچھ اس طرح جل رہی تھیں جیسے جل نہیں رہی
 ہوں بلکہ سر جھپکائے بیٹھی آگ تاپ رہی ہوں۔ ان کی اپنی آبائی جاگیر کا حصہ بھی قابل
 کاغذ تک کم ہو چکا تھا۔ حکومت نے جس قدر حصہ نواب صاحب کو مقرر کیا

تھا۔ اس میں سے پورا نصف قرض خواہوں اور ڈگری داروں کے نذر ہو جاتا ج
ان قرض خواہوں اور ڈگری داروں نے چونکہ متعلقہ کورٹ سے اپنے قرض کی وصولی
کے لیے ڈگریاں حاصل کر لی تھیں اس لیے حکومت خود نواب صاحب کے حصے سے
نصف حصہ دینے کے لیے ان میں تقسیم کر دیتی تھی۔ اور پھر یہ حصہ ہی کیا تھا۔۔۔۔۔
اوٹ پٹانگ جاگیر کی سالانہ آمدنی متعین تھی۔ ساٹھ فی صد حق انتظام کاٹ لیا۔
بچے بچے پچاس فی صد میں قرض خواہ الگ۔ حصے دار الگ۔ اور گدارہ پانے والے
ان کے سوا۔

ساری جاگیر کو بلا شرکت غیر استعمال میں لانے والا آج اتنی قلیل اور بیچ
پونج مرقم پر زندہ رہنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کر چکا تھا۔ بس یہی اس کا کارنامہ
ہے۔ اب اگر اس سے کوئی غیر فطری مطالبہ کیا جاتا کہ وہ پلاٹنگ کارڈس
کے نرم اس سے اپنی انگلیوں کے پوروں کو لوٹ نہ ہونے دے۔۔۔۔۔ دو وقت آپس
میں مل رہے ہوں تو ڈیوڑھی کے قمچے روشن ہونے سے کچھ ہی پہلے اپنے اور اپنے
احباب کے تارک یک میزوں میں آتش سیال بہا کر چراغاں نہ کرے اور کبھی کبھی اپنے
کارناموں سے قطع نظر کر کے بریز آت پیرس ہمارا بی جھانسی اور لارڈ ڈیل سن
کے اور ان کے اجداد کے کارناموں سے ذرا کی ذرا خوش بھی نہ ہوئے تو کیا اس
سے یہ مطالبہ اس کی تذلیل کے مترادف نہ ہوتے۔ لیکن برا ہوا سکھانے پڑھانے
والوں کا کہ شہزادی بیگم نے پہلے پہلے یہی کچھ کہا تھا۔

میں بھی تو ذرا دھول، اب یہ ریس، یہ شراب، یہ جھوٹا اس طرح چلے گا۔ شہزادی بیگم
نواب صاحب کے گلے میں پھنسے ہوئے پھندے کے ایک سرے کو کچھ اس بے ڈھب طور پر

بھٹے مار مار کر کھینچتی رہیں کہ ایک بار ان کے ہاتھ سے پھوٹا ہوا سہرا پھر ان کے ہاتھ نہ لگا۔ اب دکھانے والا چار چار دن گھر کا رخ ہی نہ کرے تو شہزادی بیگم....
 ”میں کبھی ذرا دیکھوں“ ”میں بھی تو را دیکھوں گی رٹ لگائے رہیں تو بھی کیا حاصل
 — نواب صاحب بھی کیا کریں گے بے چارے۔ جاگہیں تھیں، منول تھا، عزت تھی، غرض ہر قسم کی تن آسانیاں تھیں تو شہزادی بیگم کے ناز اٹھاتے تھے، غرض سیتے تھے، برہم ہو جاتیں تو سو سو طرح مارتے تھے۔ اب آدمی زیادہ اہم کاموں میں گتھ جائے، تفکرات جو ہر طرف سے آگھیریں تو ان ناز برداریوں کے لیے وقت ہی کہاں رہ جاتا ہے۔ وقت بے بھی تو دل کے اندر طنائیں گاتے والی اداسیوں کے خمیوں کو آگھیر پھینکنا بھی تو کچھ اتنا آسان نہیں ہے نا۔ اور جب نواب صاحب کئی دن بعد ڈیوڑھی پہنچے تو شہزادی بیگم دیکھنا دکھانا سب بھول گئیں۔ سب سے اہم مسئلہ جو درپیش تھا۔ اور پھر انگریزوں نے رحم جو ڈال دیا تھا۔ اپنی نرمی کو چھپا کر بولیں۔

تم پردہ لگی رکشا میں چھپ چھپ کر راتوں کو کس وکیل کے پاس جاتے تھے۔ مجھے سب پتہ چل چکا ہے۔ عدالت سے نوٹس لا کر کھڑے کھڑے مالک مکان نے اس غریب کو گھر سے نکال دیا۔ برقعہ اڑھ کر سیدھی ڈیوڑھی میں چلی آئی اور میرے پیر پکڑ لیے، کہنے لگی میں آپ کے پیر کی خاک سہی پر لوگ نواب صاحب کو میری بھی مانگ کا سینہ در سبھتے ہیں۔ در بدر کھوکھیں کھاؤں گی تو لوگ مجھ پر نہیں نواب صاحب پر انگلیاں اٹھائیں گے۔ جی میں آئی کہ بھوسے بچو کہ تمھاری آبرو کا نیلام بیچ کر لوں پر کہ داد دل دیکن اللہ رسول کے خوف سے سہم گئی اور پھر یہ بھی سوچا کہ کبھی سہی

مگر اپنی حقیقت اور حیثیت کو پہچانتی ہے۔ کہنے لگی: میں آپ کے پیر پھونے کے لالین بھی نہیں ہوں۔ میری ماں آپ کے محترم والد کے حضور میں مجرا دیتی تھیں۔“
 نواب صاحب نے دکھلا کر کہا کہ ہاں یتیم وہ جانتی ہے کہ تم کس باپ کی بیٹی ہو۔
 شہزادی مسکرائیں اور کہنے لگیں۔ لوجی اس قدر کجاہت سے کہہ رہے ہو
 جیسے تم مجھ سے کچھ کم ہو۔

نواب صاحب کچھ کہتے ہی والے تھے کہ شہزادی نے جیسے چونک کر کہا۔
 ”ہاں میں بھول ہی گئی تھی۔ تین ماہ سے لائٹ کا بل ادا نہ کرنے پر لائٹ
 کاٹ دی گئی ہے۔“ اور نواب صاحب نے مسقط بن مبرک کو رات کے اجالے
 کے انتظام کے لیے پکارا۔ مسقط بن مبرک بلائے گئے تھے ڈیوڑھی کے اندھیرے
 دور کرنے، لیکن وہ آئے تو ڈیوڑھی کے اندھیرے جیسے ڈیوڑھی سے بھاگ کر نواب
 صاحب کے سینے میں جا چھپے۔

نواب صاحب کے ذہن سے پتہ نہیں کیسے محو ہو گیا کہ کل مقدمے کی سماعت
 ہونے دیسے جان کلفٹن نے یک طرفہ ڈگری حاصل کر کے نواب صاحب کا موٹر تک
 نہ چھوڑا تھا۔

قدرت علی شونر کے گھر تین وقت کھانے کے علاوہ کہاں دس بار چائے بنتی
 اب صرف ایک بار چولہا جلنے لگا۔ خیر پھوٹا آدمی تھا۔ ایک بار کھالے بھی
 تو غنیمت ہے۔ جہاں بے شمار لوگ فاتے کرتے ہوں، وہاں ایک وقت کا کھانا
 بھی تو نعمت ہے۔ لیکن حالت تو نواب صاحب کی دیکھی نہ جاتی تھی۔ مقدموں
 کی پیروی تو خیر ان کی جوتی کرتی۔ وہ ابھی اتنے گرے بھی نہ تھے جو ہر دفتر کی بیڑھیا

چڑھتے پھرتے، لیکن بقول نواب صاحب کے، اس فرنگی نثراد، کیسے درازی کے بچے جان کلفٹن نے ایک بار تو انھیں عدالت کھینچوایا ہی۔۔۔ حج کوئی ان کا پرانا ساتھی ہوتا تو نواب صاحب جان کلفٹن کو گھپی کا دودھ یا دودلا دیتے۔ سر باز اور سر منڈھوا کر اس عمر میں اس کے عقیقے کی تقریب مناتے۔ لیکن، نیا ہی بدل چکی تھی۔۔۔ نہ مصطف اپنا، نہ انصاف اپنے بس میں۔۔۔ خیر یہ تو جو کچھ ہوتا، ہوتا ہی۔۔۔ پہلا سوال تو یہ تھا کہ استنہ باعزت خاندان کا فرد، نواب ابن نواب جس کی رکھی ہوئی عورتوں کے پٹے بھڑے لونڈے بھی موٹروں میں پھرتے۔ اب وہ خود بھلا کس طرح چل کر عدالت تک جائے گا۔ نواب صاحب بہت ادا اس تھے۔۔۔ رات بھر کروٹیں بدلتے رہے۔ جیسے ہر تار بہتر خا بہتر بن گیا ہو۔

صبح ہوتے ہوتے مسقط بن مبروک کے ذہن رسائے پھر یاوری کی۔ رسائے کی طرح چھٹے رہنے والے احباب، آفتاب سر پر آگیا تھا، تو غائب ہو گئے تھے۔ صحن ایک مکی میاں رہ گئے تھے جو آج بھی دوستی کا دم بھرتے تھے۔ لیکن مسقط بن مبروک نے دنیا کا رنگ ڈھنگ بھنگی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ زمانے کی ایک ایک کردٹ کو دکھے دل سے محسوس کیا تھا۔ انھیں نہ دوست کی دوستی پر اعتماد تھا، نہ خون کی سرخنی پر۔ سو اسی لیے ان کو اس دقت مکی میاں کی غیر متوقع آمد بھلی نہ لگی۔ ذرا کی ذرا نواب صاحب کو تخیل میں بلا کر انھوں نے کان میں کچھ کہا۔ اس کے بعد مکی میاں نے دیکھا کہ مسقط بن مبروک کو نواب صاحب نے چھین کر گلے سے لگایا۔

عدالت کا وقت ہوتے ہوتے لوگوں نے دیکھا کہ نواب صاحب کی سواری بہت

دن بعد نکلی ہے، لیکن سوائے اس کے کہ کوئی نئی بات نہ تھی کہ موٹر بدلا بدلا ہوا تھا، شو فر بدلا ہوا تھا، اور یہ دونوں بھی نواب صاحب کے تمول کی نشانی تھے، جو بد ہی رہتے تھے۔

نواب صاحب عدالت میں پہونچے تو جان کلفٹن پوچھو ہی میں پارکنگ کرنے کی فکر میں تھا۔ نواب صاحب کا موٹر پہونچا تو اس نے اپنی غلطی محسوس کی۔ اور جب دونوں اپنے اپنے موٹروں سے اترے تو جان کلفٹن نے تقریباً دہرا ہوا کہ نواب صاحب صاف صاف مٹا دیا۔ اور عدالت کی سیڑھیاں چڑھنے تک نہیں ہنس کر اور نواب صاحب کو سو سو طرح رہنمائی کر ان سے معافی مانگتا رہا۔ لیکن وہ ہی منٹ بعد وہ واپس لوٹ آیا اور سیدھے نواب صاحب کے موٹر کے پاس پہونچ کر لگا ڈرائیور سے مسلسل سوالات کرنے۔

ڈرائیور نے نواب صاحب کے دوست کی حیثیت سے ابھی ابھی جان کلفٹن کو دکھایا تھا۔ وہ موٹر کے قریب آیا تو عظیم ڈرائیور نیچے اتر کر کھڑا ہو گیا۔

کلفٹن نے اپنی ٹوٹی بھوٹی اردو میں پوچھا۔ ”نواب صاحب ادھر آیا؟“
ڈرائیور نے جواب دیا۔ ”نہیں صاحب“

”مگر کار کو پر اپری ڈسٹ نہیں کیا؟“

ڈرائیور کچھ نہ سمجھا۔

جان کلفٹن نے مگر کار پر انگلی سے۔

صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا۔

”ڈسٹ ہے نا“ اور پھونک مار اپنی انگلی کی پور پر جی ہوئی گر دجھاڑ دی۔

ڈریس پر سمجھ گیا۔

”جلدی میں صاف نہ کر سکا صاحب۔“

”دل نیو کا رہا؟“

”ٹیکسی صاب“

”ٹیکسی!؟“ — جان کلفٹن نے تعجب سے دہرایا۔ — ”فریگی کا نمبر

نہیں لگایا۔“

”آج کل بڑا نواب لوگ اور جاگیر دار پر ویٹ نمبر کا موٹر چاہتا ہے

صاب — اس لیے ہمارا سٹھ پر ویٹ نمبر پر ہی چلتا ہے۔“

”ایسا کیوں مانگتا نواب لوگ؟“

”ٹیکسی میں بیٹھنا بری بات سمجھتا ہے صاب؟“

”تم ٹیکسی ڈریس پر؟“

”ہاں صاب۔“

”فریہ ڈریس؟ (DRESS)“

”نواب صاب کے پرانے شو فر کا ہے صاب — نواب صاب یہ ڈریس

پہننے کا دور روپے علاحدہ انعام دیتا ہے۔“

”ونڈر فل، ونڈر فل“

اور جان کلفٹن نے فلک شرکان قفقہ لگایا تو ڈریس پر سمجھ نہ سکا کہ وہ نواب

صاب کا مذاق اڑا رہا ہے یا خود اس کا اپنا۔

وہ جانے لگا تو ڈریس پر نے دل ہی دل میں اس کو گالی دی۔ — لیکن

دیر گئے نواب صاحب واپس ہونے لگے تو وہ موٹر میں سوار ہوتے تک ان کے ساتھ
 تھا۔ سوار ہونے سے قبل اس نے خود بڑھ کر کار کا پٹ کھولا، اور بہت لگاتار
 سے مصافحہ کر کے مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

موٹر اڑھاٹا ہوا تو اس نے مسکرا کر نواب صاحب کے اس کے متعلق پوچھا۔
 نواب صاحب کے چہرے پر چمک پیدا ہوئی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا
 ایک ہمینہ ہوتا ہے اس کو خرید کر مسٹر کلفٹن۔ پرانی کار آپ نے جو بہتیا لی تھی۔
 یہ آپ کو پسند ہے نا۔

اس سے پہلے کہ مسٹر کلفٹن موٹر کی تعریف کرتا۔ ڈرائیور نے اسکو گھور کر
 دیکھا اور کار بڑھا دی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعیں موٹر کے شیشے سے
 چھن کر نواب صاحب کے چہرے کو اجال رہی تھیں اور وہ نمکنت سے سگارا
 جلا رہے تھے۔

کتاب سے کہتے ہیں

منوریاں خاندان بھر میں لائق فائق مشہور تھیں۔ عربی، فارسی، انگریزی، ہندی،
 زبانیں جانتے تھے اور جانا بھی کیا۔ عالموں فاضلوں کے کان کاٹتے تھے بحث و
 تخیص ہوتی، مکالمے و مجادلے ہوتے تو منوریاں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے بس مجبور
 تھی سوائی ہی کہ خیالات کی وسعتوں کا زبان ساتھ نہ دے پاتی۔ رک رک کر کلمہ کلم
 کر، چبا چبا کر کچھ اس طرح بحث کرتے کہ موضوع کتنا ہی جان دار ہو منوریاں کی
 زبان پر آکے دم توڑتا ہوا سا محسوس ہوتا۔

خیر یہ تو ان کی اپنی کمزوری تھی لیکن اس سے ان کی قابلیت اور فعالیت پر
 بھلا کیا اثر پڑ سکتا تھا وہ بلاشبہ علوم شرقیہ کے فاضل اور مغربی علوم کے ماہر سمجھے جاتے
 تھے۔ پڑھتے رہتے ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کی بیوی ان کے اس شغل سے کچھ
 بیزار نہ تھیں۔ آخر دنیا میں اور بھی تو کچھ کام تھے۔ لیکن منوریاں کو کسی کام سے

کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ تھے اور ان کی کتابیں تھیں۔ ان کتابوں اور عینک کے بیچ میں واسطے اور رابطے کا فرض انجام دینے کے لیے اگر کچھ اور تھا بھی تو وہ پکے پانوں کی خوبصورت اور ننھی منی سی گھوڑیاں تھیں اور ان گھوڑیوں کے لیے انھیں اپنی بیوی کی گوری انگلیوں کا رہین منت ہونا پڑتا تھا جو کتھے اور چونے میں کچھ اس طرح رنگ گئی تھیں کہ اب یہی رنگ ان کا اپنا اصلی رنگ ہو گیا تھا۔

مغہ میں پان کی گھلاوٹ کا احساس مٹتے ہی ان کا ہاتھ کرسی کے برابر دھری ہوئی نیپائی تک جاتا۔ کھلے ہوئے خاص دن میں سے ان کی انگلیوں کی پوروں میں ایک ننھی منی سی گھوڑی دبی ہوئی سہمی ہوئی ان کے جبروں تک جا پہنچتی۔ پھر آنکھوں کی چمک عینک کے شیشوں سے گزر کر کتاب کے صفحوں کو منور کر دیتی۔ پھر جیسے ان کے دل و دماغ منور ہو جاتے، ذہن روشن ہو جاتا۔

منوڑیاں کی کتابیں ان کی بیوی کے لیے سوتلے پائے کا طعنہ تھیں مگر کیا کرتیں یہ چاری وہ بڑے غصیلے، بڑے بارعب اور لمبے دیے آدمی مشہور تھے۔ جس بات کو وہ اصول پسندی سمجھتے تھے اس کو ان کی سقی قلبی کہنے سے بھی لوگ نہ چوکتے لیکن یہ سب کچھ ان کے پیچھے ہوتا۔ وہ بھی ان باتوں کی پروا نہ کرتے تھے۔ راجہ بھون جیسے بیٹھے تھے اور خاندان کا ہر فرد انھیں گنگوٹیلی ہی نظر آتا۔

چوڑی ہڈی اور دوہرے بدن کے مضبوط سے آدمی تھے۔ ناک نقشہ سجیلا ہی تھا لیکن رنگ کم از کم بیوی کے ساتھ ہوتے تو رنگ کا فرق اور نمایاں ہو جاتا تھا۔ مگر دانا بھی اور اس پر ٹخنوں تک چڑھا ہوا شرعی پاجامہ۔ اس کے باوجود بھی دیکھتے ہیں آنکھوں کو بڑے نہ لگتے تھے۔ البتہ جی یہ ضرور چاہتا کہ یہ سب کچھ نہ ہوتا

تو مناسب تھا اور اگر ہے کبھی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اب کس کو پڑی تھی کہ ان کے حیلے میں ان کی ہدایت میں اتنی دل چسپی لیتا۔

لیکن سنتے ہیں کہ ان کا یہ انداز مرشدانہ ان کے سانس سسر کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ پرجہ پوچھیے تو بیوی بھی دل ہی دل میں ان کے اس رہن سہن سے اٹلاؤ گئیں لیکن کچھ تو مذہب و شرع نے زبان پر تائے ڈال رکھے تھے کچھ شرم و حیا نے لب سے دیے تھے اور سب سے بڑھ کر منور میاں کی اصول پسندی نے اس جذبہ ہی کو ان کی بیوی کے دل میں دفن رکھا تھا کہ کبھی وہ ترنگ میں آکر ان کے سینے سے لگی ہوئی گھنٹیں نہ تھکتیں۔ — اسی اس داڑھی داڑھی کے چکر سے باہر نکل آؤ نا۔

الشر رکھے منور میاں کے ساتھ بچے تھے۔ آٹھویں کی آمد آگئی۔ وہ ہر بچے کو اللہ کی برکت پر محمول کرتے اور اس کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار رہتے۔ ایک برکت نازل ہو کر کچھ ہی عرصے گزرے کہ دوسری برکت کے نزول کے لیے اللہ میاں کو ہموار کر لیتے۔ رہ گئی بیوی سودہ تو ایک ذریعہ تھیں۔ پھر محکوم و مجبور الگ۔ منور میاں نیم خدا تھے۔ ان کا التفات ہی تو ان کی بیوی کے لیے سب کچھ تھا۔ جب چاہا کہ لیا ہے کچھ قفس بہاراں — کے مصداق۔ جب چاہتے کچی نیند سے بیدار کر لیتے۔ اور اس طرح برکت کا نزول ہوتا رہتا۔

پھر یہ برکتیں بخوں غاں کی منزلوں سے گزرتیں تو صحن میں پہنچتیں۔ صحن سے احاطے کے وسیع میدان تک جاتیں۔ میدان سے قبروں کے چوتروں پر آتیں پھر قبروں پر چڑھ کر منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتیں اور انھیں گھوڑا بنا کر ان پر سواری کرتیں۔

منورمیاں اپنی سسرال ہی میں رہتے تھے۔ خسر صاحب کے جہاد مجاہدین کوئی حسب
 بڑے پائے کے بزرگ گزرتے تھے۔ صاحب کمال، صاحب فن، صاحب علم و دانش
 منورمیاں کے خسر کو اس درگاہ کی دیکھ بھال اور تعمیر و ترمیم کے لیے ”دفتر امور مذہبی“
 سے سالیانہ مقرر تھا۔ وہ اس درگاہ کے سجادہ نشین بھی تھے، ستولی بھی۔ جو کچھ سالیانہ
 مقرر تھا وہ بھینٹا لیا جاتا تھا کہ ٹوٹی ہوئی قبریں بنائی جاسکتی تھیں۔ احاطے کا گرا بڑا
 درست کیا جاسکتا تھا۔ معمولی نہیں اوسط پیمانے پر سالانہ عرس منایا جاسکتا تھا۔
 چراغاں کیے جاسکتے تھے اور منورمیاں کے خسر یہ سب کچھ بڑی لگن سے کرتے، بڑی
 فراخ دلی اور ایمان داری سے اپنے فرائض سے عمدہ بہ آہوتے۔ اس کے باوجود
 بھی اتنا بچ رہتا کہ اچھا کھاتے، اچھا پہنتے اور ڈھتے اور منورمیاں کے کفیل ہوتے۔
 منورمیاں بے چارے علم کی پیاس بجھانے چلے تو یہ سمندر تھیں اتنا وسیع نظر آیا
 کہ اس بحر بیکراں سے صدف و گوہر کی تلاش نہ تھیں نہیں کا نہ رکھا۔ بیوی سے واسطہ
 نہ بچوں سے تعلق خاطر۔ برکتوں کا نہ بول ہونا اور یہ برکتیں ساس، سسر کو سو نہی
 جاتیں۔ پھر قبروں کے سینوں پر چڑھ کر مونگ دلتیں۔ بیوی بے چاری شین کی طرح
 خام مال منورمیاں سے ملتی۔ اور غوغاں کرتا، ہمکتا، مسکراتا بچہ ان کے لیے
 حاضر کر دیتیں پھر منورمیاں بے چارے علم کے سمندر میں ایک ماہر غواٹ کی طرح
 غوطہ لگا آتے۔ لیکن ان کی تشنگی بڑھتی ہی جاتی۔

آدمی شد بد پڑھ لے، اتنا کہ کچھ کر کے اپنا اور اپنی بیوی بچوں کا پیٹ پال لے
 تو آدمی آدمی ہی رہے گا۔ نہ بڑا آدمی بن سکے گا، نہ مرد مومن، خاندان کا ہر فرد
 یہی سب کچھ کرتا تھا۔ لیکن منورمیاں نے کچھ اور ہی کھان رکھا تھا۔ انھیں علم کے بحر بیکراں

کو اپنے دماغ کے کوزے میں بند کرنا تھا انھیں وہ سب کچھ بننا تھا جو ان کے خاندان میں
 آج تک کوئی نہ بن سکا تھا۔ سو انھوں نے اپنے لیے سمندر وں اور طوفانوں کو چنا بھلا
 بیوی اور بچوں کو وہ ساتھ لے چلتے تو ڈوب نہ مرتے بے چارے۔ انھوں نے دانشمندی
 سے کام لیا اور ساس سسر کو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں بھی سونپ دیں۔
 ۴۔ اب وہ تھے اور علم کا طوفان تھا۔ اب وہ تھے اور علم کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔
 منشی عالم، منشی فاضل اور ادیب کامل تو تھے ہی انگریزی کا چمکا پڑا تو ایک
 پرچہ دے کر گریجویٹ ہو بیٹھے۔ پھر اس کے بعد انھوں نے کبھی ارسطو کو ارسطو نہیں کہا
 ارسطو اٹل ہو گیا وہ۔ اور جس دن ارسطو، ارٹائل بنا ہے، اس دن سے انھیں
 خود اپنی داڑھی کھٹنے لگی۔ شرعی پاجامہ کھسک کر ٹخنوں تک آپہنچا۔
 ایک دن چپکے سے اٹھے، نماز فجر ادا کی اور پڑوس کے حجام کے گھر پہنچ کر
 کٹڑی کھٹ کھٹادی۔ عزیز باہر نکلا تو فوری پہچان گیا کہ منور میاں ہیں۔ جھک
 کر ادب بجالایا۔ منور میاں بوکھلائے سے بس اس کا منہ تکتے رہے اور اپنی داڑھی
 کھچاتے رہے۔ اس نے بہت لجاجت اور عجز و انکساری سے اتنی صبح تشریف
 لانے کی وجہ پوچھی۔ منور میاں بے چارے مشکل کہہ سکے کہ ان کی داڑھی میں جوئیں پڑ گئی
 ہیں جوئیں پڑ جائیں یا چھپکیاں اور گر گٹ جا گھسیں، حجام بے چارہ بھلا اپنے منہ سے
 تو کہہ نہیں سکتا تھا کہ سر کا تشریف انھیں پلک جھپکنے میں داڑھی مونڈ کہہ سارے کے
 سارے بال ”دامن مراد“ میں بھر دوں گا۔ وہ بے چارہ حکم کا منتظر بس انھیں دیکھتا
 رہا۔ منور میاں پر شرم غالب تھی لیکن ارٹائل نے پھر شہ دی۔ مہٹ کر کے اٹھ بیٹھ
 کہہ دیا کہ بھئی مونڈ ہی جو۔ یہ جوئیں بہت —

حجام کے کان میں جیسے کن کھجور جاگھسا۔ اسے یقین نہ آیا۔ اس نے آنکھیں مل کر پھر بغور منوریاں کو دیکھا جو نظر نیچی کے ارٹاٹل سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ جب حجام اپنی ہنرمندی اور چابک دستی کا مظاہرہ کر چکا تو واقعی منوریاں کے چہرے پر فوراً برس رہا تھا۔ وہ منٹ و منٹ تک بڑے چاڈے سے خود اپنا چہرہ آئینے میں دیکھتے رہے۔ حجام جہاں دیدہ تھا۔ بھانپ ہی گیا ہو گا کہ ان کے ٹھوس بالوں میں خوردبین لگا کر دیکھنے سے بھی جوئیں نہ ملیں گی۔ اس نے پھر بھی تکلف کر ہوئے کہا۔ ہی ہی ہی ہی۔ سرکار چہرہ کیسا نکھر آیا ہے۔

منوریاں یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ بھئی چلے آنا ایک آدمہ گھنٹے اپنا انعام واکرام کھی لے لینا اور ذرا بچوں کے بال بھی بڑھ گئے ہیں۔ وہ شرماتے شرماتے گھر پہنچے تو ان کی بیوی نے دیکھا کہ منوریاں اپنے سر کے علوم شریفہ کسی حجام کے ہاں چھوڑ آئے ہیں۔ بچے ابھی مسٹھی نیند کا مزہ لوٹ رہے تھے۔

اپنی بیوی کی باجھیں کھلی ہوئی دیکھ کر انھیں بڑا سکون ہوا۔ وہ دوڑی دوڑی ان کے قریب آئیں تو منوریاں ۱۰ ادغلب نظر دل سے انھیں اس طرح دیکھا کہ بیوی نے بھی تکلف بر طعن کر دیا۔

اس تہذیبی سے خاندان کا قریب قریب ہر شخص خوش ہوا۔ خسر صاحب تو پہلے ہی سے درگاہ کے سجادہ نشین اور متولی ہونے کے باوجود صف کے زنی چہرہ رکھتے تھے انھیں اپنے داماد کی اس نزکت پر اس قدر بھی پیار آیا کہ وہ سمجھتے تھے کہ منوریاں ہیں اب بہت سی تبدیلیاں آئیں گی۔ اب وہ اپنا ہر کام اللہ اور خسر کو کم سوئیں گے

اور زیادہ علمی آدمی بن جائیں گے۔ اپنی بیوی اور بچوں کی ضروریات کی کفالت کو وہ ادلیں اہمیت دیں گے۔ علم کے بیکراں سمندر سے انھیں اب تک جو کچھ ہاتھ لگا ہے اس کا مول تول کرنے کے لیے وہ بھرے بازار میں نکل آئیں گے تو اہل نظر ان کے جوہر پکھیں گے کبھی۔

لیکن سنورمیاں کو علمی زندگی سے جیسے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ فارسی اور عربی کتابیں پھوٹیں تو اب وہ انگریزی کتابوں کے ہو رہے۔ گلوڑی صفحہ میں رکھتے اور عینک سے گزر کر نظروں کی کرنیں کتاب کے صفحات کو اجال دیتیں۔

بیوی نے ایک دن دبی زبان سے احتجاج بھی کیا کہ انھوں نے جب اتنی بڑی بڑی ڈگریاں لے لیں ہیں تو اب انھیں اپا بچوں کی طرح بیٹھ رہنا نہیں چاہیے۔ سنورمیاں نے محسوس بھی کیا کہ احتجاج کے پیچھے ان کی بڑھتی ہوئی قابلیت اور علمیت سے جیلنے والوں کا ایک انبوہ کثیر ہے جو ان کی بیوی کو ان کی بے علمی کے خلا اسامہ ملے۔

وہ کچھ منعقد سے ہو گئے۔ کہنے لگے میں علم کا طالب ہوں علم کا بیوپاری نہیں ہوں۔ آج وہ بھی جیسے کچھ ٹھان کر آئی تھیں۔ کہنے لگیں۔ بیوی بچوں کے بیوپاری نہ ہو۔ سنورمیاں کے لیے اب یہ بات صاف تھی کہ برس برس کا دبا ہوا لاد آج لینے سارے بند توڑ کر نکل جانا چاہتا ہے۔

لہذا انھوں نے گلوڑی اٹھاتے ہوئے کہا کہ بھئی چلی بھی جاؤ۔ میرے صفحہ کیوں آتی ہو۔ مجھے آج اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ عورت واقعی ناقص العقل ہے۔

وہ لوٹنے لگیں تو کچھ بڑ بڑائی گئیں جو منور میاں کے پلے نہ پڑا۔
لیکن منور میاں نے محسوس کیا کہ داڑھی کی برکتوں سے روگردانی کر کے
انہوں نے کچھ اچھا نہیں کیا۔

ان کا وہ رعب داب ہی جاتا رہا جو ان کے نام سے شہرت پا گیا تھا۔
وہ بچے اور اڑدوس پڑدوس کے لوگ اب بھی ان کا مان کرتے تھے۔ گھر
کے بچوں کا تو اب بھی وہی عالم تھا جو داڑھی کے وقت تھا۔

بھلیکی ہوئی ریت پر گھر دندے بن رہے ہوں۔

یا چھوٹی ڈھکینوں میں بھر کر اس ریت کے کیک بنائے جا رہے ہوں اور
دوکان سجائی جا رہی ہوں۔

حمام چینی کی رکابی اسٹیننگ بنی ہاتھوں میں گھوم رہی ہو اور صفحے سے موڑ
کی آواز نکالتے دوڑیں لگائی جا رہی ہوں۔

مکئی کے سوکھے ڈنٹھل دونوں رافوں کے بیچ اسپ تازی کی طرح پھل رہا

ہوں۔

منور میاں کے ادھر سے گزرنے کی بات ہی بچوں کے کانوں تک پہنچ
جاتی تو سارے گھر دندے دیران ہو جاتے۔ سچی ہوئی دوکانیں جیسے لٹ لٹا
جاتیں۔ موٹروں کے انجن سرد پڑ جاتے۔ اسپ تازی نڈھاں ہو کر کہیں کوئی
میں اڑیاں رگڑتے۔

غرض کہ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاتا۔ ویسے منور میاں کوئی بجاوہ تو نہیں تھے
منور میاں صرت ناشتہ اپنے عزیز واقارب کے ساتھ کرتے۔ ان کے ناشتہ

کر چکنے تک سارے بچے گرفتار کر کے کہیں بھیجا دیے جاتے۔ خاندان کے دو چار آدمی ان کے دسترخوان پر ہوتے۔ بچوں کو سختی سے تاکید کی جاتی کہ منور میاں کے کھا چکنے تک کوئی بھنگی کا نام زبان پر نہ لائے۔ ملازمین تو خیر مزاج انسان تھے ہی۔ صبح صبح کہا کر بھنگی نہ جلا گیا ہوتا اور منور میاں کے ناشتے کے دوران میں آدھلنے کا احتمال ہوتا تو گیسٹ ہی پر ملازم کو کھڑا دیا جاتا کہ اس کو بٹھا رکھے ایسے میں ان کے کھا چکنے تک ان کی بیوی بڑی پریشان سی رہتیں کہ جاتے کب کیا ہو جائے۔

بات اصل یہ تھی کہ بے چارے منور میاں اپنے مزاج کی نفاست سے مجبور تھے۔ نوالہ اٹھا رہے ہوں، کسی نے بھنگی آیا کی صدا دی۔ بس لمبو جھٹک کر ادا دل پر اور اٹھ کھڑے ہوتے۔ ایک نوالہ حلق کے نیچے پھر نہ اٹتا۔

ایسا ایک بار نہیں بار بار ہوا۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ کھڑے بیوی بے چارہ کی روغنیاں، خالص دودھ میں سنی ہوئی پالسن کافی کاپیالہ اور نیم برشت اٹھائے جاتیں۔ منہ سمجھا کر، منتیں کر کے کھلاتیں۔ تب کہیں انھیں سکون ہوتا۔ آخر منور میاں دن رات جو کتابیں پڑھتے گزرتے تھے۔

دماغی کام جسمانی محنت سے زیادہ تھکا دیتا ہے۔

اب اس کو کیا سمجھے کہ اتنا بڑھا لکھا عالم، فاضل آدمی بھنگی کے ہاتھوں مارا جا رہا تھا ہم غیروں کو ہمدردی ہوتی ہے وہ تو پھر بیوی ہی تھیں۔

منور میاں کو ایک اور بات سے پڑھتی۔ ان کی بیوی اور ساس سسر نے مرغیاں پال رکھی تھیں۔ کنبہ اچھا خاصا ہی جو تھا۔ اس کے باوجود بھی انڈوں کی کمی

ہی محسوس ہوتی۔ منورمیاں کے حصہ میں زیادہ ہی چلا جاتا۔ خیر ان سے کسی کا کیا مقابلہ۔ دن بھر وہ بھلے بھلے کھتے اور ان کی کتابیں اور ان کا کمرہ۔ کہیں آنا نہ جانا۔ دوپہر کے کھانے کے لیے بلایا جاتا تو نوکر ہوش ہاش آوازیں لگاتے پھر بچے بوڑھے سب سمجھ جاتے کہ منورمیاں کھانے کے لیے آرہے ہیں۔

بھئی بات یہ تھی کہ منورمیاں کو بی گٹ گٹ کٹاک اور ان کے میاں مرغ کی علی الاعلان مجامعت سے کچھ گھن سی آتی تھی، مکن انکھوں سے دیکھتے جاتے اور لا حول پڑھتے جاتے۔ اس گھن کو جو اس منظر کو دیکھنے سے ان میں پیدا ہوتی تھی وہ کس شیطان کا کرشمہ سمجھتے۔ پھر اس شیطان کا نام ان کے ذہن میں کچھ اس طرح ابھرتا۔ فرائیڈ فرائیڈ۔ اور وہ فرائیڈ پر بھی لا حول بھیجنے لگتے۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے منورمیاں کو خیال آیا کہ یورپ جا کر تحصیل علم کو درجہ کمال تک پہنچانا چاہیے۔ یوں بھی یہ بات مشہور تھی کہ جو دینے کی خاک بھجو آئے اس کی عاقبت سنور جاتی ہے لیکن جو لن رن کی خاک بھجو آئے اس کا دلہ رچھ اس طرح دور ہو جاتا ہے کہ دونوں عالم کی زندگیاں سدھر جاتی ہیں۔

اپنی بیوی کو منورمیاں تین دن تک طرح طرح سے خوش کرتے اور رچھا رہے۔ بات بات میں نہ صرف سکر اتے بلکہ پھیر پھاڑ کر سکر اہٹوں کا جال سا بننے رہتے اور اس جال کے تانے بانے میں ان کی بیوی بے طرح جکڑی جاتی۔

منورمیاں کے مزاج کی یہ نرمی، یہ خشکی، یہ گرا خشکی ان کی بیوی کے دامن دل کو جیسے مونگوں اور موتوں سے بھر رہی تھی۔ ان کی بیوی کے لیے۔ ان کی تبدیلی ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ کسی اچھائی کے لیے وجوہ کی ضرورت تو ہوتی نہیں جو

ان کی بیوی اس طرح سوچتیں کہ ان ہر بانیوں اور عنائتوں کا سبب کیا ہے۔ ویسے منورمیاں دل کے برے تھے بھی نہیں۔ بس ان کی اصول پنڈیاں تھیں جو انھیں شقی القلبی تک لے جا رہی تھیں یا پھر لوگ انھیں جبراً دھکیل کر ان سرحدوں تک پہنچا رہے تھے۔

کسی پر زور یا کمزور لمحے میں منورمیاں نے بیوی کے آگے اپنی تجویز بھی تو دے آج ہی سے مستقبل کے خواب دیکھنے لگتیں۔ کھاتے دھاتے منورمیاں۔ اچھا سا سجا سجا یا گھر۔ دڑتا بھاگتا موٹر اور ان سب پر ان کی اپنی حکمرانی۔

لیکن منورمیاں پورے پانچ سال کے بے جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اتنی لمبی مدت۔ اس پر اتنا درد و راز کا سفر۔ اس خیال اور تصور سے ان کی بیوی آنکھیں نہ ملا سکیں۔ اور شفاف شفات سے آنسو موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگے۔ منورمیاں کے اتنے دن کے چاؤ اور محبت نے جن مونگوں اور موتیوں سے اپنی بیوی کے دامن دل کو بھر دیا تھا انھیں موتیوں میں سے چن چن کر جیسے وہ منورمیاں کو لوٹا رہی تھیں۔

”وہ نہ یوں ہی کس کام کے جو آپ کے کام نہ آئیں اور پھر آپ یہ سب کچھ ہمارے لیے ہی تو کر رہے ہیں۔“

”الشریبہ نظر رکھیے۔ وہ بڑا کارساز ہے۔“

واقعی خود منورمیاں پر کبھی کبھار رقت سی طاری ہو رہی تھی۔

اس طرح منورمیاں کے خیالات عوام میں بدل گئے۔ ان کی بیوی نے اپنے ماں باپ کو بھی آمادہ کر لیا۔ منورمیاں کے لندن جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

تو ہمیں بھر کے اندر اندر ان کے خواب تعبیر کی صورت میں ڈھل رہے تھے۔ سوٹ، موزے، ٹائیاں، شوز ایک ایک چیز خرید لی گئی۔ ان دنوں پتلون کے گیلے لگتی تھیں۔ ڈھب سے گلیں لگانا تک انھیں نہ آتا تھا۔ اور پھر آئے بھی تو کیوں۔ انھیں کیا پڑی تھی جو ان بدعتوں کے پیچھے سر مار تے پھرتے — شرعی پاجامہ ابھی انھوں تک آسکا تھا۔ وہی کیا کم تھا۔

ان کے جانے کا دن آیا تو ایک دوست نے ان فراموش کو پورا کیا۔ بنا سوار کر جب منور میاں کو ان کے کمرے سے باہر لایا گیا تو واقعی وہ ”فل سٹا“ میں بڑے وقیع اور معتبر سے لگ رہے تھے۔

ان کی بیوی نے انھیں آبدیدہ ہو کر بڑی محبت سے دیکھا۔ اس نے بلائیں لیں۔ خسر نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے — خاندان بھر کے چھوٹے بڑے مرد اور عورت بھی جمع تھے۔ منور میاں بڑی تکنت اور وقار سے نگاہ غلط اندازہ ہر ایک پر ڈال لیتے۔ بہ مشکل ایک آدھ ادھورے جیلے سے کسی کو نواز دیتے۔ کسی کی بات سنی ان سنی کر دیتے اور آگے بڑھ جاتے۔ ان کی تکنت کا یہ حال تھا جیسے وہ لندن جا نہیں رہے ہوں بلکہ وہاں سے سارے یورپ کی ڈگریاں بڑھ کر واپس آ رہے ہوں۔

جب وہ اپنے بیمار بچے سے ملنے کے لیے اس کے پلنگ کے قریب پہنچے تو بڑی سنجیدگی سے اپنی چھڑی سے اس کے گال چھو لیے — اور بس۔ کسی بڑی بوڑھی نے کہا بھی کہ میاں سا ہمارا سال کیلئے اتنے دور دراز جا رہے ہو تو بھلا اپنے تخت جگر سے ڈھنگ سے تو مل لو۔ ذرا اس کے تسلی ہی دو بیٹا

تو جلد ہی اچھا ہو جائے گا۔ لیکن اس حجم غفیر میں بوڑھی کی آواز کسی نے سنی کسی نے نہیں۔ لیکن منور میاں تو بس اس طرح مطمئن سے لوٹ گئے۔ جیسے انھوں نے بہت کچھ کر دیا ہے۔ اور یہ ان کی اصول پسندی تھی۔ اب لوگ کچھ بھی سمجھیں۔ ان کی جدائی کا منظر بھی بالکل وہی تھا جو ایسے مواقع پر دیکھنے میں آتا ہے۔

لیکن خاندان بھر کے سارے بچوں کی کانفرنس میں بلا اختلاف رائے یہ بات طے پا گئی تھی کہ منور میاں کے جاتے ہی آج کا دن ان کی قید و بند کی زندگی میں مکمل آزادی کا تصور لے کر آئے گا۔ اور پھر یہ جو اہلی کے بڑے بڑے دوست ہیں ان پر کچی بچی امیاں رہیں گی اور نہ امرود کے درختوں پر بارغ کے پانی کی حکومت چل سکے گی جو ناگ سانپ کی طرح چھن کھولے رکھوالی کرتا رہتا ہو۔ ایک صاحب نے تو یہ رائے بھی دی کہ موسمی اور سنگتروں کے سارے بیڑوں پر جو کانٹے ہیں ان کو بلیڈ سے چھیل کر ان درختوں کو اس قابل بنا دیا جائے کہ ہم جب چاہیں ان پر چڑھ کر سارے پھلوں کا صفایا اور چری اور کر سکیں۔

منور میاں کی بیوی اور ان کی ساس کے دل اس جدائی سے مغموم تھے لیکن اس غم کے پیچھے ایک درخشاں مستقبل کی جوت بھی تھی جو تسلی دیتی اور اس بندھائی تھی۔ منور میاں کے دوست احباب ان کی متواضع فطرت کے گرویدہ تھے۔ دوست کے پچھڑنے کا غم انھیں بھی تھا لیکن ساتھ ہی اس بات کی خوشی بھی تھی کہ جب وہ لوٹیں گے تو محفلیں اور اہتمام سے سجیں گی۔

لیکن منور میاں کے بچے خاندان بھر کے دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر یوم نجات منا رہے تھے۔

بچے بے چارے شاید حق بجانب ہی تھے۔ اس لیے کہ منور میاں کی نسبت یہ بات عام تھی کہ اکھنوں نے کبھی بچوں کے سر پر ہاتھ نہ رکھا، نہ گال چھوئے نہ پیار کیا۔ ہاں ڈانٹ ڈپٹ ضرور کی اور اکثر کی۔ کبھی کبھی تو معمولی قصور پر بھی کچھ زیادہ ہی سزا دی۔ مارا پیٹا۔ دن دن بھر کمرے میں بند کر دیا اور خود کتابوں میں گم ہو کر سب بھول بھال گئے۔

ایسے میں ان کی بیوی کی بھی مجال نہ ہوتی جو بلا اجازت قید سے ان کو نکال لاتی۔ وہ بس تڑپ تڑپ کر کمرے کے دروازے سے لگی آنچل سے اپنے آنسو خشک کرتی رہتیں۔

بہر حال منور میاں آج جدا ہو رہے تھے۔ تو ان کی اس جدائی سے کوئی غمگین تھا تو کوئی خوش بھی تھا۔

اب ان کی بیوی بس ڈاکیے کا انتظار کیا کرتیں۔ بچوں کے لیے منور میاں کے غائبے جہاں ساری آزادیاں دے دی تھیں وہیں ایک بالکل انوکھے قسم کی لذت سے انھیں آشنا کر دیا تھا۔ اور وہ لذت تھی کہ ایک اکٹی اور دنی پا جانے کی خوشی۔ منور میاں کی بیوی نے یہ کہہ رکھا تھا کہ جو بچہ میاں کا خط لے کر آئے گا اس کا منہ میٹھا کر ایا جائے گا۔

یا تو منور میاں کے رعب داب نے انھیں جکڑ رکھا تھا یا اب ان کے خط کے انتظار نے ان کے کھیل کو دکا بہت سادقت اپنے لیے مختص کر لیا تھا۔ صرف فرق تھا تو مجبوری اور مختاری کا۔ غلامی اور آزادی کا۔ جبر اور اختیار کا۔ منور میاں کے خط کا انتظار سب کے سب بڑی لگن سے کرتے۔ ہر ایک دوسرے

پر بقت لے جانے کی کوشش میں گیٹ کے چکر کاٹتا رہتا کہ کہیں ڈاکیہ نہ آجائے
در خط دوسرے کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ اسی خط کے بہانے اب ان کے قدم
گیٹ سے باہر نکل آئے۔ پھر بستی تک جا پہنچے۔

منوریاں کا خط آیا تو انھوں نے بیوی کو بہت کچھ لکھا تھا۔ آخر میں یہ
لکھی لکھا تھا کہ اس سر زمین انرنگ پر میں نے پہلا سجدہ کیا ہے۔
پھر جب بھی منوریاں کا خط آتا، بچوں کو کبھی دو نیاں ملتیں کبھی برت کے
لڑو، کبھی مٹھائی کے دوسنے،

اس طرح منوریاں کے خط ان کی نظروں میں منوریاں سے بہتر ٹھہرے۔
دو سال گزر گئے تو خاندان بھر میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔ منوریاں
کی بیوی اور ان کی ساس نے نماز شکرانہ ادا کی۔ منوریاں نے لکھا تھا کہ ”میں
آکسفورڈ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری لے چکا ہوں۔ اب پی۔ ایچ۔ ڈی
کی تکمیل جلد سے جلد کر لوں گا اور لوٹ آؤں گا۔ ارادہ ہے کہ یہاں سے
لوٹے ہوئے بہت ساری چیزیں لیتا آؤں۔ گھر کی تزئین و آرائش کے
لیے یہاں جو نئی نئی چیزیں ملتی ہیں ان کا وہاں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔
تھامے اور بچوں کے لیے تو ایسی ایسی چیزیں لیتا آؤں گا کہ خاندان بھر میں دھوا
مچ جائے گی۔ اور ہاں کبھی کسی اچھے سے خوبصورت گھر کی تلاش شروع کر ادو
اب تجھے پر دفسری کرنی ہے تو ڈھنگ کا گھر چاہیے۔ گھر ہی پر ایک اچھی سی لائبریری
چاہیے۔ اچھا سا ڈرائنگ روم چاہیے۔ ڈائننگ روم بھی ہو، اس کے بغیر
اب میرے لیے کھانا مشکل ہو جائے گا۔ گھر بالکل انگریزی دفعت کا ”ماڈرن“ ہو۔

اب اس قبرستان میں رہ کر بھلا میں کیا کر سکوں گا۔ اور اگر تم سچ پوچھو تو یہاں آنے کے بعد مجھے تو سارے کا سارا ہنرستان ہی قبرستان نظر آتا ہے۔“

آخری جملہ منورمیاں کی بیوی کو کچھ بھایا نہیں پھر بھی یہاں سے وہاں تک دور دور تک، حد نظر تک چاندنی ہی چاندنی تھی جو ان کی آنکھوں کے آگے بچھو ہوئی تھی۔ اس ٹھنڈی اور سہانی چاندنی میں ان کو اپنا خوبصورت مستقبل بالکل صاف اور واضح دکھائی دے رہا تھا۔

منورمیاں نے اپنے گھر کا سارا نقشہ کھینچ کر خود ہی کھجوا یا تھا۔ اب جو کمی رہ گئی تھی اس کی تکمیل کے لیے منورمیاں کی بیوی تصور ہی تصور میں اس نقشے میں رنگ آمیزی کرتی رہتیں۔ کہ یکا یک ایک نئی نوپلی تھر۔ برٹی جس میں لکھا تھا کہ میرے دوست منور علی خاں پر فارج کا حملہ ہونے سے انھیں ہاسپٹل میں شریک کر دیا ہے۔ انھیں لکھنے پڑھنے سے ڈاکٹر دوں نے منع کر رکھا ہے۔ وہ روز صحت ہیں۔ تردد و فکر کی کوئی بات نہیں۔ اکثر پر نظر رکھیے اور ان کے لیے دعا کیجئے۔ وہ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔

خط ملا تو جیسے چکی ہوئی چاندنی کو کالے کالے بادلوں نے چاند سے اس طرح علاحدہ کر دیا کہ نہ چاندنی کا وجود رہ گیا نہ چاند کا۔

اسیروں کے سارے لاد شکرنا امیدی کے جنازے بن بن اٹھتے رہے۔ منورمیاں کی بیوی اور منورمیاں کی ساس سسر اس درگاہ کا طواف کرتے رہے جس درگاہ کے سہارے ان کی زندگی کے اچھے دن وابستہ تھے۔ پھر یکا یک معلوم ہوا کہ منورمیاں لوٹ رہے ہیں۔ ڈاکٹر دوں نے اب انھیں وہاں

رہنے سے منع کر دیا ہے۔ قہر کے بعد وہ اتنے کھردر ہو گئے ہیں کہ ڈاکٹر دلوں کا خیال ہے کہ اب وہ دلوں کے موسم کی شدت کو برداشت کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ ان کے لیے اپنے وطن کو لوٹ جانا ہی بہتر ہے۔

منوریاں لوٹ آئے تو اُس دن میں اور اس دن میں کوئی خاص فرق نہیں تھا جس دن وہ اپنا وطن اور گھر بار چھوڑ کر پردیس گئے تھے۔ اور آج جب کہ وہ اپنے دیس میں، اپنے گھر میں، اپنے بیوی بچوں میں لوٹ آئے تھے تو میدان جنگ سے بھاگے ہوئے سپاہی کی طرح اس کی بہادر بیوی نے اس کے زخموں کی مرہم پٹی اس لیے نہیں کی کہ زخم پیچڑ پر تھا سینے پر نہیں تھا۔

یہاں پہونچے تو اپنے وطن کی آب و ہوا انھیں راس آئی۔ وہ دن بدن صحت مند ہوتے گئے۔ وہ پیرجن کے سہارے دیر تک کھڑا رہنا اور چلنا پھرنا ان کے لیے مشکل تھا تیز گامی کی طرف مائل تھے۔ اب وہ چھڑی ٹیکے بغیر بھی چل لیتے۔ منوریاں کی بیوی کے دل پر بچھاہٹے ہوئے بادل اب پتھر پھٹ رہے تھے اور چاند بادلوں کی ادٹ سے کچھ اس طرح تاک بھانک کر رہا تھا جیسے موقع کی تلاش میں ہو کہ چپکے سے دل کی ساری دھرتی کو اپنی نورانی چادریں لپیٹ سمیٹ لے جلتا بنے گا۔

اور منوریاں کی بیوی اس چاند کی ایک ایک کرن کو پا کر اپنے غم کو دل میں محفوظ کر لینا چاہتی تھیں۔

ان کونوں میں جتنے رنگ تھے ان رنگوں سے ان نقشوں میں رنگ آمیزی کرنا چاہتی تھیں جو منوریاں نے بڑے چاؤ اور بڑے جتن سے اپنے خطوط کے ذریعہ لکھیں

تحفے میں بھیجے تھے۔

لیکن منور میاں بے چارے پھر اس ہندوستان کے ایک قبرستان میں آجسے تھے جو سارے کا سارا خود ایک بہت بڑا قبرستان انھیں نظر آنے لگا تھا۔

اب انھیں بہر حال یہیں زندگی تلاش کرنی تھی۔ فی الوقت ان کا معمول یہ تھا کہ صبح اٹھتے ہی بڈی پیتے۔ پھر حواج ضروریہ سے فارغ ہوا کہ سوٹا پہننے پڑے۔ اتہام سے ڈائی باندھتے یا بول لگاتے اور بڑی تلکنت سے چوتے پر قبروں کے پنج بجھی ہوئی کرسیوں پر جا براہتے۔ کچھ دیر خشکف انگریزی اخباروں کا مطالعہ کرتے پھر ان کے دوست و احباب کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

منور میاں کے پہلو دار شخصیت، ویسے تو پہلو در پہلا تھی لیکن ان کی شخصیت کے دور رخ بڑے متضاد تھے۔ وہ شخص جو اپنے برائی بچوں میں اصول پرندی کے نام پر شقی قلبی کی سرحدوں تک جا پہنچا تھا۔ اپنے دوست احباب یا بڑا ہی سر بجاں مرنج، متواضع اور منکسر المزاج سمجھا جاتا تھا۔

دوستوں کی تواضع کر کے، انھیں کھلا پلا کے ایک عجیب قسم کی خوشی انھیں محسوس ہوتی۔ ایک ایسی خوشی جس کی لذتوں سے صرف جذبات آشنا ہوتے۔ انہماک من نہیں ہوتا۔ منور میاں نے برے دن کم ہی دیکھے تھے۔ اچھے دن کبھی اچھے نہ رہتے تھے تو برے دنوں سے دتر ہی رہے۔ اب ان اچھے اور برے دنوں کے ہیر پھیر میں ان کے ساس سسر کا خیال یہ تھا کہ منور میاں کے دن خواہ وہ اچھے ہوں یا برے خود ان کے اپنے تو ہیں نہیں۔ خود ان سے منسوب کیے جائیں وہ تو بس اس طرح آن بے تھے جیسے گھر دامادی پہلے ہی سے طے تھی۔ ایسے میں اچھے دن اگر ساس سسر کے ہوں تو ان کے

بھی ہوئے، برے دن اگر ساس سسر کے ہوں تو ان کے بھی ہوئے۔
 بات کچھ بھی ہو لیکن ایسا ضرور تھا کہ منور میاں کماؤ پوت بھی ہوتے تو ان کی
 شخصیت، ان کے دوست احباب کے لیے جیتاں نہ ہوتی جو آج نہ کمانے پر ساس
 سسر اور بیوی بچوں کے لیے بنی ہوئی ہے۔

دوست احباب سے جو وقت بچتا وہ کتابوں کی نذر ہو جاتا۔ یورپ جانے
 سے قبل کتابوں کی یہ رفاقت ان کی بیوی کو سو سو طرح کھلتی تھی۔ لیکن جب انھوں
 نے آکسفورڈ سے ایم۔ اے کامیاب کیا تو بیوی سمجھ گئی کہ اس کامیابی میں کچھ ان
 کتابوں کا بھی دخل ہے جو بڑی بے ترتیبی اور کس سپرسی کے عالم میں پڑی منور میاں
 کی منتظر تھیں۔

ان کی بیوی نے بھٹاڑ جھٹک کر ایک بار انھیں قرینے سے جمایا بھی تھا۔
 لیکن آج کتابوں کی طرف منور میاں کی وابستگی ان کی بیوی کے لیے دائمی ایک
 سانچہ تھی۔ ایک ایسا سانچہ جو ماضی کی پھوٹی بڑی ساری محرمیوں کو دہرانے کے درپے
 ہوں ایک ایسا سانچہ جو بجائے خود ماضی اور مستقبل بن کر مقدر بن گیا ہو۔

یورپ سے لوٹے تھے تو پان کی گلیوں کو ”بڈی“ نے اس طرح نکال پھینکا
 تھا جیسے گوری فرنگ ہندوستانی کلمہ ہی کو گھر سے باہر کرتی ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ
 منور میاں نے دونوں میں سمجھوتہ کر دیا۔

اب گلیاں بھی تھیں۔ ”بڈی“ بھی تھی۔

چلے خواہ دن میں سو بار منگوائی جائے منور میاں کی بیوی اسے ”بڈی“ ہی کہتیں۔
 اور یہ سلسلہ دن بھر کچھ اس طرح چلتا کہ منور میاں کی بیوی ”بڈی“ گلیوں اور

کتا بول کے درمیان معلق معلق سی لٹکا کر تیں۔

منوریاں کے ایک پر وغیرہ دوست نے انھیں لکھا کہ میں تمہارے لیے یہاں
بینورسٹیاں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ تین ساڑھے تین سو روپے تو تمہیں بہر حال
مل ہی جائیں گے۔ اس کے بعد اس مالک سے پہلے قدم تو جم جائیں۔

جس وقت خط پہنچا ہے اس وقت منوریاں حسب دستور فل سوڑ پینے
ہوئے اپنے دوستوں کے ساتھ جو تیسے پر قبروں کے بچوں پنج بیٹھے تھے۔
خط پڑھ کر وہ مسکرائے۔ اس مسکراہٹ میں طنز تھا۔ حقارت تھی۔ پھر اپنے احباب
سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

دامخ خراب ہو گیا ہے۔ اکمل کمال عرشی کا۔

احباب نے پوچھا۔ آخر کیا بات ہے۔ اور یہ کون صاحب ہیں۔

منوریاں کہنے لگے کبھی آنکھوں میں ڈھونڈیں مجھ سے دو سال سینیر تھا۔ معاشیات سے
ڈاکٹر ٹ کیا ہے۔ آدمی بڑا پر خلوص ہے۔ اسے بہت محبت ہے مجھ سے۔ دراصل
بات یہ ہے کہ جب وہ ڈاکٹر ٹ کر رہا تھا اس کے تھیسس میں نے ہی لکھے تھے اور
اس کو زوری منظور کر لیا گیا۔ میرا بڑا معترف ہے۔ ہیشہ کہتا تھا کہ تم نہ ہوتے تو جانے
کب میں ڈاکٹر ہوتا۔

منوریاں ڈاکٹر نہ ہو سکے تھے تو اس طرح اپنے ساتھی ڈاکٹروں پر اپنی ذہنیت
جھلا کر شاید اپنے نفس کی تسکین کا سامان مہیا کر لیتے۔ ان کی ایسی شہمی میں ان کی محدود
صداقت بھلک پڑ تیں۔

ایک صاحب نے پوچھا۔ ”پھر کیا کوئی بد تیزی کی ہے انھوں نے“

”نہیں بھئی بد تمیزی کیا کرے گا وہ مجھ سے۔ ہزار پندرہ سو تو کم تاہی ہوگا۔
برہنہ جو ہے۔ اب مجھے لکھا ہے کہ تین سو ساڑھے تین سو کی کچھری قبول کر لوں۔
اتنا گیا اگر اتنا تو نہیں ہوں میں۔“

”ہاں بھئی تین سو ساڑھے تین سو ماہانہ تو آپ یورپ جانے سے پہلے لے سکتے
تھے۔“ ایک صاحب نے ہاں میں ہاں ملا کر حق دوستی ادا کیا۔

منور میاں کہنے لگے۔ بات حقیقتاً یہ ہے کہ میرا بہت مان کرتا ہے۔ وہ چاہتا
ہے کہ میں یونیورسٹی میں پڑھاؤں تو ملک و قوم کا بھلا ہوگا اور آنے والی نسلیں ایسی
نکلیں گی کہ ہم ان پر غرہ بھی کر سکیں تو کم سے کم اعتماد تو کر سکیں گے۔

تو پھر کیا سوچا ہے تم نے۔ ایک بے تکلف دوست نے پوچھا جن کے پاس کوئی ڈگری
نہیں تھی لیکن وہ گورنمنٹ میں سات سو روپے کے ملازم تھے۔

بھئی اس میں سوچا کیا ہے۔ میں تو اچھا کر دوں گا۔ میں اپنی صلاحیتوں کو
اس طرح برباد کرنے سے تو رہا۔ ملک و قوم کا بھلا دیکھوں تو لیڈر نہ بن جاؤں۔
مجھے تو اپنا علم بانٹنا اور تقسیم کرنا ہے لیکن اس طرح بھی نہیں۔ آخر میرے بھی تو
بال بچے ہیں۔

اور منور میاں نے دھڑ سے انکار کر دیا۔ صاف لکھ دیا کہ مجھے برہنہ کے
تو بہتر ورنہ مجھے معذور سمجھو۔ اپنی صلاحیتوں اور زندگی کو میں اتنے سستے داموں نہیں
بیچ سکتا۔

سائرس نے جب یہ سنا تو دل ہی دل میں کاہش کھا کر رہ گئے۔ منہ کھول کر یہ
بھی نہ کہہ سکے کہ صاحبزادے اپنی قابلیت پر اتنا غمنہ بھی نہ کرو۔ زمانہ نازک سے گزر رہا ہے۔

تر آکر رہا ہے۔ آج جو دن کے اجالے ہیں وہ کل کے اندھیرے بن رہے ہیں۔

بیوی نے محسوس کیا کہ منورمیاں ٹھیک کر رہے ہیں۔ اتنا سب کچھ پڑھ لکھ کر صرف تین ساڑھے تین سو روپے پر کون اوقات خواب کرے۔

لیکن جب خط لکھ کر منورمیاں لفافہ بند کرنے لگے تو ان کی بیوی کے دل میں خیال گزرا کہ ہاتھ پکڑ کر منورمیاں کو لفافہ بند کرنے سے روک دیدیں۔ اور انھیں بتائیں کہ دیکھو تو یہ تمھارے بچے کیسا پھوٹ پھاٹ کر بڑھ رہے ہیں۔ یہ مونا تو کیسا قدر نکال رہی ہے۔ لیکن منورمیاں لفافے کا گوند زبان پر پھیر کر اسے بند کر چکے تھے۔

سننے ہیں کہ منورمیاں نے ایسی ہی کئی نوکریوں کو ٹھکرا دیا تو شاید نوکریوں نے بھی مل جل کر سازش کر لی اور منورمیاں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور رکھا۔

تیرکمان سے نکل جاتا ہے تو حیدر کے بیوی سے ہو کر ہی سہی مل تو سکتا ہے لیکن یہ نوکریاؤں کا گھائل خود ہی ہوتا ہے جو اسے کھودیتا ہے۔

اور اب منورمیاں کی سمجھ میں یہ بات آچکی تھی کہ یہ سب کچھ انھوں نے کھودیا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہو گیا کہ منورمیاں بے چارے قبروں کے بچوں کی طرح کھڑے اپنی نکٹائی اور پتلون کی کریمز درست کرتے رہ گئے۔

چار دن کے مونیہ نے منورمیاں کے خسر کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر دیں تو جو تر کے بچوں پنج رہیں دفنائے گئے جہاں منورمیاں کی بیٹھک بنی اور کرسیاں بچھتی تھیں۔ منورمیاں زندگی کے کسی حادثے کے آگے سر ہٹا دینے والے نہیں تھے۔ اپنے کسی پیارے کی موت زندگی پر وار کر سکتی ہے۔ گھاؤ لگا سکتی ہے۔ بہت کیا تو ایک آدھ ناسور کہیں رکھ چھوڑا لیکن سرے سے زندگی کے قدم پکڑ کر اس کو پتہ تو نہیں لگا سکتی

منوریاں کو یہ گھاؤ وقت کے ہر ہر قدم پر لگتے گئے۔ انھوں نے باپ کی محبت اگر کبھی ہٹی تو اپنے خسر ہی کے روپ میں۔ اور اس روپ نے انھیں ہر قسم کا اطمینان دے رکھا تھا۔ آرائش دے رکھی تھی، لیکر اب وقت ان سے اپنی ناقدری کا امتحان لینے کے لیے جیسے مسلح ہو کر آیا تھا اور انھیں لٹکار رہا تھا۔

منوریاں نے جب یہ لٹکا رہی تھیں تو ان میں ٹائی بانہنے کی ہمت نہ رہی کریمز کیا سوٹ ہی کو وہ بھول بیٹھ چیکے سے اشارہ کر کے بیوی کو جیسے منہ کر دیا کہ ”بڑی“ پٹینے کا یہ وقت نہیں ہے۔ اور تیس عالم میں بیٹھے تھے اسی عالم میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ علی کو پکارا اور لٹکارتے ہوئے نبرد آزمانی کے لیے کو دپڑے۔ لیکن ان کے پیروں میں ریشہ تھا۔ ان کا ہاتھ مفلوج تھا۔ وقت نے انھیں معاف نہیں کیا بڑے گھر سے گاؤ لگائے۔ خون رسی کا خون نہ ختم پھر مندر میں ہوا۔

منوریاں کے برادر بستی جب ان کے خسر کے بعد درگاہ کے سجادہ نشین قرار پائے تو اس قبرستان سے منوریاں کو اپنی زندگی کا ناٹھ توڑ لینا پڑا۔ وہ ایک چھوٹا گھر لے کر الگ بھاڑے۔ آسفورڈ یونیورسٹی کا ایم۔ اے کاٹوں ان کی زندگی کا سب سے بڑا انعام تھا۔ ایسا انعام جسے آدمی اپنی صحت دے کر حاصل کر لے دو سرے معنوں میں زندگی دے کر۔

انھوں نے بھاری پونچھ کر اس گون کو نکالا جس پر بے بیوی کا جھبہ بنا کر کھیلے تھے دھو دھلا کر ان کی بیوی نے گون کو کھونٹی سے تنگا دیا۔ یہ گون منوریاں کا علم تھا۔ ان کا ادراک تھا، ان کا فلسفہ تھا۔ ان کی تفصیل اور عظمت تھا جو ادارے کی دیوار پر بھول رہا تھا اور یہی گون ان کے ایم۔ اے ہونے کی دلیل تھا۔ کوئی ڈگری کسی نے

ان کے پاس نہیں دیکھی۔ نہ خود انھوں نے ہی دکھانے کی کوشش کی۔

اس طرح انھوں نے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی درس و تدریس کے لیے ایک خانگی ادارے کی بنیاد ڈالی۔ لیکن انھیں حسرت ہی رہی کہ ادارے کے نام کا بورڈ بنوا کر اپنی ڈگری اور اپنے نام کے ساتھ باہر لگا سکتے تاکہ ان کی ڈگری دیکھ کر شاگردین علم کا اشتیاق بڑھتا۔ کوئی بھولا بھٹکا طالب علم کسی نہ کسی طرح اس درس گاہ کے دروازے تک آ پہنچتا تو منورمیاں بڑے چاڑھے بڑی شفقت اور محبت سے اسے اپنی درس گاہ میں کھینچ لاتے اور اس کو علم کے بیکراں سمندر سے چُن چُن کر وہ سارے موتی دے دیتے جن کی آب و تاب کے سہارے زندگی کے بھرے بازار میں وہ ان کے کھرے کھرے دام وصول کر سکتا۔ کم سہی لیکن جتنے بھی شاگرد منورمیاں کے نکلے ہیں ان میں سے اکثر اپنی اپنی یونیورسٹی کے لیے قابل سمجھے گئے۔ اور اچھی خدمتیں پائیں۔ اور اس فخر نے منورمیاں کی گردنوں کو کچھ ایسا دلاسا دیا کہ ان کی زندگی کے دنوں میں کچھ اصفافہ ہو گیا۔

لیکن پھر ان کی صحت بہت تیزی سے ان کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ اپنے ٹیچم شیجم جسم کا بوجھ اٹھاتے غالباً ان کے پیر تھک گئے چنانچہ پیروں نے ہی سب سے پہلے ان کا ساتھ چھوڑا اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے۔

پھر بلڈ پریشر کا عارضہ لاحق ہوا۔ پھر صنف النفس نے ان کی ساری ہستی کو اٹھل پھل کر رکھ دیا۔

درس و تدریس اب منورمیاں کے بس کا روگ نہ تھا۔ صرف آنکھیں تھیں جو ان کا ساتھ دے رہی تھیں۔ منورمیاں یورپ سے جتنے فلسفے آئے تھے ان سب

فلسفوں کے مدّ عمل نے انھیں مذہب سے قریب ترکہ دیا تھا۔ زندگی کی تشنگی اور ہر محرومی پر انھوں نے خدائے عزّوجلّ کا شکر ادا کیا اور یہی ایلان کا شمار بن گیا تھا۔

قادِ مطلق پر اتنے کمبل ایتقان اور اتنے مستحکم ایمان سے پتہ نہیں آدمی کا اعتماد اپنی ذات پر سے اکٹھ جاتا ہے یا عشرتِ قطرہ ہو کہ دریا میں فنا ہو جاتا ہے ہی کو حاصلِ زینت سمجھتا ہے۔ بہر حال کچھ ہو سب کچھ چھین جانے کے بعد بھی جائنتی اور جھجکتی ہوئی آنکھیں منور میاں کے ساتھ رہ گئیں تو انھوں نے رب العزت کا سو سو طرح شکر ادا کیا کہ انہی آنکھوں کے سببان کی کتابیں آج بھی ان کی رفیق تھیں، مولنس دغخوار تھیں۔

لیکن یہی آنکھیں منور میاں کے لیے غم و اندوہ کا ایک ایسا تحفہ بن جاتیں کہ ان کی ساری کتابیں ان کے برابر، ان کے سرِ پائے، ان کے اطراف چھوٹی چھوٹی قبروں کی مانند بکھر جاتیں۔ اور ان قبروں کے پاس سے ان کی جوان جوان بیٹیاں کچھ اس طرح گزرتیں جیسے اپنی جوانیوں کو ان کی کتابوں میں تلاش کرتی پھر رہی ہوں۔

منور میاں آنکھیں بن کر لیتے، گرہ گڑھاتے۔ یا اللہ مجھ سے میری آنکھیں چھین لے لیکن پھر سنبھل جاتے۔ توبہ استغفار کر کے اپنی بھینگی ہوئی آنکھوں کے کناروں کی بنی کو اپنے دامن میں چھپا لیتے۔ پھر گرہ گڑھاتے۔ یا اللہ مجھے معاف کر دے۔ یہ کفرانِ نعمت ہے۔ اب وہ چاہنے لگے تھے کہ زمانے بھر کی محبتیں بٹور کر چھپے چوری اپنے

والی بچوں میں تقسیم کر دے اس لیے کہ خود ان کے پاس دینے کے لیے اب کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ وہ شخص جو خود دوسروں کے لیے قابلِ رحم ہو وہ کسی کو کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ یہاں تک کہ محبت بھی نہیں اس لیے کہ وہ غرض منہ سمجھا جاتا ہے۔ پڑھتے پڑھتے سو جانا۔ سوتے سوتے آنکھیں کھولی کہ اپنی کتابوں میں کھو جانا۔ اب بھی سب کچھ ان کی زندگی میں رہ گیا تھا۔

پتہ نہیں اب بھی کتابیں انھیں کچھ دیتی تھیں یا وہ خود ہی اپنی آنکھوں کی جوت ان کتابوں کی پینٹ کر رہے تھے۔

ایک رات جب وہ تھکے ہوئے تھے اور محل دکھائی دے رہے تھے ان کی بیوی اور بچوں نے انھیں کتابیں دیکھنے سے منع کیا۔ چپ چاپ فرمانبردار بچے کی طرح انھوں نے کتاب رکھ دی کھولی کھولی آنکھوں سے سب کو دیکھا، اپنی بیٹیوں پر نظر اٹھی تو جیسے وہ ان سے آنکھیں چرا رہے تھے۔ پھر انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

اب کی بار کسی نے نہیں دیکھا کہ آنکھیں بند کرنے کے بعد آنکھوں کے کناروں کی نمی کو انھوں نے اپنے دامن سے پونچھا بھی۔ صبح ہوئی تو اپنی آنکھوں کی جوت وہ کتابوں کی نذر کر چکے تھے۔ کتابیں ان کے آس پاس پھیلی ہوئی تھیں۔ پھوٹی پھوٹی قبروں کی طرح جن میں زمانے بھر کا علم دفن تھا۔ نئے پرانے سارے فلسفے دفن تھے۔

منوریاں نے اسی قبرستان سے اپنا ناطہ پھر سے جوڑ لیا جو انھوں نے مجبوراً توڑ لیا تھا۔ لیکن اس چوڑے پر انھیں جگہ نہیں ملی جہاں بیٹھ کر وہ اپنی کتابوں کے بل بوتے پر اس ناقہ رشتاں کی زندگی کے منہ پر تھوک دیا کرتے تھے۔

بھنیں چبوترے کی حصار کے باہر ہی دفن کر دیا گیا۔
 سُنتے ہیں پڑوس کے درزی کے کسی کھلنڈرے لٹو کے نے ان کے سر بانے دیوار
 پر ٹیڑھے میڑھے خط میں کبتے کی طرح حاشیہ بنا کر لکھ چھوڑا ہے۔

میر سنور علی خاں مرحوم

ایم۔ اے (اگسٹ)

یہ لڑکا اپنے کسی ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ میرے باپ نے ہی سنوریاں کا ایم۔ اے

کا گاڈن سیاتھا۔

شکن در شکن

”میں کیا کرتا بھلا۔۔۔“

”میں نے قرآن سر پر اٹھا کر قسم کھالی کہ وہ بچہ میرا نہیں ہے۔“
اتنا کہتے کہتے وہ آئیدہ ہو گیا۔

آدمی زندگی بھر جھوٹ بول سکتا ہے۔ لیکن آفسو کبھی جھوٹ نہیں بولی سکتے۔

مجھے داحصف سے جبرزدی تھی۔ وہ اتنا بامردت اور اس قدر نرم آدمی تھا کہ اس پر لگائے ہوئے اہتمام کو وہ اپنے سر بھی لے سکتا تھا۔ میں نے ایسا آدمی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ آپ خنجر لے کر اس کے سینے پر سوار ہو جاسیے وہ آپ کی کلانی مرد لڑکے خنجر آپ سے پھین لینے کی کبھی کوشش نہیں کرے گا۔ آپ سے التجا کرے گا کہ بھئی مجھے چھوڑ دو۔ پھینا بھپٹی میں کہیں تمہارا رابطہ نہ بنی نہ ہو جائے۔

وہ نہ رہے ہوئے گلے سے کہنے لگا کہ کیا تمہیں بھی میری بات کا یقین نہیں ہے۔“

میں نے اس کو تسلی دی۔ ”یار تجھے تھاری بات کا اتنا ہی یقین ہے جتنا خود
تھاری بھیسکی ہوئی آنکھوں کو ہے۔ لیکن۔۔۔“
”کہہ بھی چکو بیٹی۔۔۔ یہ لیکن کیا ہے؟“
”لیکن۔۔۔ یہی کہ مجھے تھاری یہ بزدلی پسند نہیں ہے۔“

وہ بکوں کی طرح رونے لگا۔۔۔

”تم اسے بزدلی کہتے ہو۔ جھوٹ سے انکار بزدلی نہیں ہے؟“

”میں نے کب کہا۔۔۔ جھوٹ سے انکار بزدلی نہیں ہے۔ لیکن تم جس انداز سے
انکار کرتے ہو وہ انداز ہی سچائی کا سب سے بڑا دشمن ہے تمہیں اس طرح اپنے آئینوں کو
نہ کرنا چاہیے۔ اس سے سچائی مر جاتی ہے اور جھوٹ نئی طاقتوں کے ساتھ زندہ ہوتا
ہے۔ تم سچ کو زندہ رکھنے کی خاطر جھوٹ کے منہ پر کھٹوک کر گزریوں نہیں جاتے جرات
کی یہ کمی اہمیت کا یہ فقدان آدمی کو محرومیوں کے ان ڈھکے پھپھے گوشوں میں چھوڑ آتا ہے
جہاں سے نکل آنے کا پھر راستہ نہیں ملتا۔“

”تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔؟“

”تمہیں یہی کرنا چاہیے کہ تمہیں کچھ نہیں کرنا چاہیے۔“

”پھر۔“

”تم بہ بانگِ دہل کہہ دو کہ یہ اتنا بڑا نہ جھوٹ ہے کہ اس سے میرا کوئی علاوہ
ہو ہی نہیں سکتا۔ اور بڑے اعتماد سے اس دنیا کو نظر انداز کر کے قدم آگے بڑھا لو جو
تمہارے پیچھے پیچ رہا ہے۔ تم پر کیمچر اچھال رہی ہے۔ تم جب اسے خاطر ہی میں نہیں
لاؤ گے تو جھوٹ اپنی موت مر جائے گا۔“

شکن در شکن

”میں کیا کرتا بھلا۔۔۔“

”میں نے قرآن سر پر اٹھا کر قسم کھالی کہ وہ بچہ میرا بیٹا ہے۔“

اتنا کہتے کہتے وہ آبدیدہ ہو گیا۔

آدمی زندگی بھر جھوٹ بول سکتا ہے۔ لیکن آتش کبھی جھوٹ نہیں بولی سکتے۔

مجھے داحضہ سے جبر دی لگتی۔ وہ اتنا بامردت اور اس قدر نرم آدمی تھا کہ اس پر لگائے ہوئے تمام گودہ اپنے سر بھی لے سکتا تھا۔ میں نے ایسا آدمی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ آپ خنجر لے کر اس کے سینے پر سوار ہو جاسیے وہ آپ کی کلائی مرد کلائی خنجر آپ سے پھین لینے کی کبھی کوشش نہیں کرے گا۔ آپ سے التجا کرے گا کہ کھٹی جھجھوڑ دوسرے پھینا پھینٹی میں کہیں تمہارا لہو نہ زخمی نہ ہو جائے۔

وہ نہ رہے ہوئے گلے سے کہنے لگا ”کیا تمہیں بھی میری بات کا یقین نہیں ہے۔“

میں نے اس کو تسلی دی۔ ”یار مجھے تمہاری بات کا اتنا ہی یقین ہے جتنا خود
تمہاری بھیسکی ہوئی آنکھوں کو ہے۔ لیکن۔“

”کہہ بھی چکو بھئی۔ یہ لیکن کیا ہے؟“

”لیکن۔۔۔ یہی کہ مجھے تمہاری یہ بزدلی پسند نہیں ہے۔“

وہ بکوں کی طرح رونے لگا۔

”تم اسے بزدلی کہتے ہو۔ جھوٹ سے انکار بزدلی ہے؟“

”میں نے کب کہا۔۔۔ جھوٹ سے انکار بزدلی نہیں ہے۔ لیکن تم جس انداز سے
انکار کرتے ہو وہ انداز ہی سچائی کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ تمہیں اس طرح اپنے آنسو خلع
نہ کرنا چاہیے۔ اس سے سچائی مر جاتی ہے اور جھوٹ نئی طاقتوں کے ساتھ زندہ ہوتا
ہے۔ تم سچ کو زندہ رکھنے کی خاطر جھوٹ کے منہ پر تھوک کر گزریوں نہیں جاتے۔ جرات
کی یہ کمی اہمیت کا یہ فقدان آدمی کو محرومیوں کے ان ڈھکے چھپے گوشوں میں چھوڑ آتا ہے
جہاں سے نکل آنے کا پھر راستہ نہیں ملتا۔“

”تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔؟“

”تمہیں یہی کرنا چاہیے کہ تمہیں کچھ نہیں کرنا چاہیے۔“

”پھر۔“

”تم بہ بانگِ دہل کہہ دو کہ یہ اتنا مجرمانہ جھوٹ ہے کہ اس سے میرا کوئی علاقہ
ہو ہی نہیں سکتا۔ اور بڑے اعتماد سے اس دنیا کو نظر انداز کر کے قدم آگے بڑھا لو جو
تمہارے پیچھے جھج رہی ہے۔ تم پر کیچڑ اچھال رہی ہے۔ تم جب اسے خاطر ہی میں نہیں
لاؤ گے تو جھوٹ اپنی موت مر جائے گا۔“

وہ سگریٹ جلا کر کچھ اس طرح نیچی نیچی نظروں سے اپنے ابھڑے ہونٹے سینے کو دیکھنے لگا۔ جیسے رازدوں کے اس خوانے سے سب سے قیمتی راز جن لینا چاہتا ہے جو اسے بے گناہ ثابت کر سکے۔

میں نے اسے پھر پھیرا۔ ”باپھوں میں دیا ہوا سگریٹ ایک حقیقت ہے تو اس کا دھواں تمھاری آنکھوں کو مٹات نہیں کہے گا اس طرح گردن جھکائے کیا سوچ رہے ہو۔“ ۹

اشکوں کی جگہ سگریٹ کے دھوئیں نے اب اس کی آنکھوں کو پانی سے پھلکا رکھا تھا۔ لمبا سا کش لے کر وہ کہنے لگا۔

”یار دنیا عجیب ہے“

”اہمیت دو تو سب کچھ ہے، نہیں تو کچھ بھی نہیں“

”نہیں یار تم نہیں جانتے۔ اب دیکھو نا۔“

وہ کہتا کہتا رک گیا۔ چاروں طرف نظریں گھما کر اس طرح دیکھا جیسے میرے سوا اور بھی کوئی ٹھپ کر سنا رہا ہو۔

”کوئی نہیں ہے۔ کہہ بھی چکوا ب۔“ میں نے ہمت بندھائی۔

”وہ بچہ اسی مرشد کا ہے جس کے ہم دونوں“

”تم دونوں جس کے مرید ہو۔“ میں نے جلدیے جینی سے پورا کر دیا۔

”ہاں“

”تمھیں یقین ہے؟“

”اتنا ہی جتنا یہاں تمھارے اور میرے وجود کا اس وقت یقین ہو سکتا ہے۔“

”پھر تم نے صاف صاف سب کے ہنڈ پر کہہ کیوں نہیں دیا؟“
 ”کیسے کہہ دوں یا ر۔“

”ایسے ہی جیسے اب مجھ سے کہاہے۔“

”تمہاری بات اور ہے۔“

”یہ سب کچھ اس ہے۔“ میں برہم ہو گیا۔ ”تم میں اتنی جرات ہی نہیں ہے کہ تم روشنی کو روشنی کہہ سکو اور اندھیرے کو اندھیرا۔ اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ کچھ ہی دن پہلے اپنے اس مرشد میں جلوہ ہی جلوہ دیکھتے رہے ہو۔ نور کا نور۔“
 ”ایسا نہیں ہے۔“

”ایسا ہی ہے۔ تم شاید بھول رہے ہو کہ تمہیں نے مجھ سے کہا تھا کہ تم جب اپنے مرشد کے سامنے ہوتے ہو تو ایسا محسوس کرتے ہو کہ جیسے کسی طاقت نے، کسی عظیم سچائی نے، کسی روشنی نے۔ تمہیں اپنے احاطے میں محصور اور محفوظ کر لیا ہے۔“

”اور تم اس بات کی ہنسی اڑاتے رہے ہو۔“

”اور تم آج ہنسی اڑانے کی طاقت سے بھی محروم ہو گئے ہو۔“ میں نے پھر

درا کیا۔

”لیکن وہ مجھ سے محبت کرتی ہے!“

”تم آج بھی یہی سمجھتے ہو!“

”آج بھی میرا جی چاہتا ہے کہ میں یہی سمجھوں۔“

”تم پاگل ہو گئے ہو، تم جیسے آدمی کے پیچھے اپنی تو انارٹیاں صرف کرنا بجائے

خود بے وقوفی ہے۔“

وہ کچھ دیر درود پڑھا کر نکلتا رہا۔ ایسی نظروں سے جیسے درود پڑھا اس کو تنگ لہے ہوں اور وہ خائف خائف سا کھنکھاس دیکھ رہا ہو۔ دیکھے جہاں رہا ہو۔

جب جنون کا یہ عالم ہے تو بھوٹ موٹ ہی کہہ دو کہ بچہ میرا ہے۔ نہ تھا وہی محبوبہ کی رسوائی ہوگی نہ ہی تمھارے مرشد کی عظمت میں کوئی فرق پڑے گا۔ لیکن اس نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

”اچھا اب چلتے ہیں۔“ وہ یکایک کھڑکھڑا ہوا۔
میں نے بھی روکنے کی کوشش نہیں کی۔

چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”کچھ روپے مجھے قرض دے سکتے ہو؟“

اس نے اپنی دوستی کی اتنی طویل مدت میں پہلی بار مجھ سے قرض مانگا تھا۔ میرا عالم یہ تھا جیسے میں کہیں کا نہیں رہا ہوں۔ جیسے زمانے بھرنے اپنے پیروں تلے مجھے روند کر کھینک دیا ہے۔ میری جیب اس طرح خالی تھی جیسے اس کے قرض مانگنے پر میرا دماغ خالی خالی سا ہو گیا تھا۔ میں نظریں نیچی کیے چپ چاپ سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔
”میں ضرور لوٹا دوں گا یا رے“

میرے پس و پیش پر اس نے مجھے غلط سمجھا۔

میں نے چپکے سے اپنی سوتے کی جڑا دی انگوٹھی اتار کر اس کی انگلی میں پہنا دی جو چھ آٹھ ماہ قبل میری ہونے والی دھن کے والدین نے میری ”مگنی“ طے ہونے پر مجھے تحفے میں دی تھی۔

”یہ کیا کرتے ہو؟“

”میرے پاس یقیناً مانو اس وقت کچھ بھی نہیں۔ تم اسے کہیں گرو دیں رکھا کر

کام نکال لو۔ پیسے آنے پر پھر اگر مجھے لوٹا دینا۔“
 وہ انکو کھٹی جیب میں ڈال کر تیزی سے نکل گیا۔ شاید وہ پھر دور رہا تھا۔
 وہ جا چکا تو میں دیر تک اسی کے متعلق سوچتا رہا۔

اس سے ملنے کے بعد میرے ذہن میں اکثر سوئے ہوئے نئے سراٹھاتے۔ وہ نئے جن کا تعلق اس کی اپنی ذات سے تھا۔ اس کی اپنی محبتوں سے تھا۔ اس کی اپنی ہنگامہ پرورد اور شدید عشق بازی سے تھا اور ان کی چھوٹی بڑی داستاؤں سے تھا۔ ان داستاؤں سے جو اس کی نوٹ بک کے صفحات میں اختصار کے طور پر حروفِ تنجی کی صورت میں محفوظ تھیں۔

اسے ۳۱ جنوری ۱۹۴۵ء تا ۱۲ جون ۱۹۴۹ء — اب یہ الف۔ انوری بھی ہو سکتی ہے۔ آنسہ بھی یا کوئی اور۔

”ت“ سے ۲۲ جون ۱۹۴۹ء تا ۲۱ جنوری ۱۹۵۱ء — اس حد تک مجھے معلوم تھا کہ یہ کوئی تہنیت تھی۔ جو واصف کے لیے آئیوڈین پی لینے کی کوشش میں پکڑی گئی تھی۔ اور بعد میں کسی ضلع میں کسی بیٹری بیوپاری سے بیاہی گئی۔

”ج“ سے ۶ مارچ ۱۹۵۱ء تا ۱۱ مارچ ۱۹۵۱ء — یہ بھی مجھے یاد ہے۔ یہ جھیلہ تھی۔ یو۔ پی کے کسی ضلع سے کچھ دن کے لیے اپنے شوہر کے ساتھ حد آباد آئی ہوئی تھی اس لیے کہ یہاں اس کے شوہر کے کچھ رشتہ دار تھے جب اس کے شوہر کو کچھ شبہ ہوا تو خود جھیلہ نے واصف کے خلاف اس کے کان بھروسے۔ پھر ایک رات کو جھیلہ کے شوہر نے واصف کا گریبان پکڑ لیا جس کا نتیجہ ہوا کہ وہ اس کا کمرہ آٹھ دس دن تک مقفل رہا۔ اس کے ملنے جلنے والوں میں یہ بات مشہور ہوئی

کہ وہ اپنے گھر گیا ہے لیکن میں ہاسپٹل میں اس سے ملتا رہا۔

یہ عشق و محبت کی داستانیں الف سے لے کر دالسلام تک اس کی نوٹ بک میں بکھری پڑی تھیں۔ جو آج اس کے چلے جانے کے بعد مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ بچہ داصف کا نہیں ہے۔ بچہ داصف کا ہو ہی نہیں سکتا۔

مجھے ان چلاتی ہوئی داستانوں کی چیخ و پکار کو غلط سمجھنے کا کوئی حق ہی نہیں تھا۔ اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ داصف کی پیاس، داصف کی تشنگی، پہلے پہل اس کی خود بنی اور پھر اس کا مقدر بن گئی۔

اس نے چھوٹے بڑے کئی عشق کیے۔ اتنے شدید عشق بھی کیے کہ اس کا پاگل ہو جانا یقینی تھا لیکن وہ کبھی پاگل نہیں ہوا۔ نہایت احتیاط سے مجرمیوں اور ناکامیوں کے درمیان لٹکتا رہ گیا۔ انجام کو جانے بغیر اس نے ہر محبت کی ناکامی پر دوسری محبت کی بنیاد رکھ دی۔

”سن“ سے اس نے بے اندازہ، بے پناہ اور طویل المیعاد محبت کی۔ اس محبت میں شاید وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا۔ لیکن اس محبت اور فتح نے اس کی رگ دپے میں نہ ہر کے وہ نشتر توڑ کر رکھ دیے جن کی کھٹک اور کسک اس کی زندگی کا حاصل ہو کر رہ گئی۔ اس کا نام غالباً سردر جہاں تھا۔ جس نے داصف کو مرد کی طرح عورت کے قریب آنے کا حوصلہ دیا۔ پندار عطا کیا۔ لیکن اس کے بدلے اس نے گھر بھر کی دولت سمیٹ لی۔ اس کا نام نہاد عشق کے ہاتھوں داصف جیل جاتے جاتے بچا۔ اس نے ایک جوہری کو دھوکا دے کر زیور حاصل کیے اور جب فافوف نے اس کو اپنے شکنجے میں کس لیا تو اس کی ایک متمول رشتہ دار نے اس کو اس مصیبت سے نجات

دلالتی۔

مجھے یاد ہے ان دنوں داصف کا عجیب عالم تھا۔ اس کو جیسے سب کچھ حاصل تھا لیکن کچھ بھی حاصل نہ تھا۔ سرور کی ہر چھوٹی بڑی خواہش کی تکمیل اس کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ اور اس خوشی کے حصول میں اس نے اپنی قریب ترین بہنوں کو ذہنی اور قلبی اذیت پہنچانے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔ اس کو بس ہمیشہ یہی فکر دامن گیر ہوتی کہ سرور کو کوئی ایسی نرالی چیز تحفے میں پیش کی جائے کہ وہ مارے خوشی کے پھولی نہ سلے۔ اور ان تحفوں کے سہارے اس کی محبت پر دان چڑھے۔ اور اس طرح وہ اپنے اس حسنی کارڈ بار کو محبت کا لفظ دے کر خود قریبی میں مبتلا ہو جاتا۔

ان دنوں وہ جب بھی مجھ سے ملتا کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے اس نے کوئی ایسا چیز اپنا زندگی سے کھو دی ہے جو سب سے زیادہ اہم تھی لیکن وہ کیا چیز تھی یہ خود داصف کو بھی یاد نہیں رہا تھا۔

وہ باتیں کرتا کرتا نکالیا کہ اس طرح اٹھ کھڑا ہوتا جیسے اسے یقین ہو گیا ہو کہ اب اس مقام پر اس کا ایک منٹ کا قیام بھی اس کی زندگی کی ساری پونجی اس سے چھین لے گا۔ وہ کہتا: ”یار۔ والہا نہ عشت کرتی ہے مجھ سے۔ ایک بل مجھ سے جہا نہیں رہ سکتی۔“ مجھ داصف کی اس دیدہ دلیری پر ہنسی آجاتی مجھے محسوس ہوتا کہ داصف بڑی سفاکی سے جھوٹ بول رہا ہے۔ ایک ایسا جھوٹ جو ہر جذبے کا قاتل ہو۔ ایک ایسا جھوٹ جس کے ہاتھوں خلوص مرتا ہے تو بھر زندہ نہیں ہونے پاتا۔ اور اس کے بعد صرف COM PLEX آدمی کے ساتھ رہ جاتا ہے اور کچھ نہیں رہتا۔

مجھے معلوم تھا کہ داصف اتنا معصوم آدمی نہیں ہے جو سرور جہاں کے والہانہ عشق

اور ہوس کے درمیان خطا فاصل نہ کھینچ سکے وہ سب کچھ جاتا تھا لیکن دھوکا دینے اور دھوکا کھانے میں اس کو جو لذت ملتی تھی وہی شاید اس کی دانست میں اس کا سب سے بڑا وصف تھا۔ اس طرح جب اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تو بارے ہوئے جواری کی طرح آخری داؤ لگا کر مطمئن ہو رہا۔ اس لیے کہ اس کا یہ داؤ چل گیا تھا۔ اور وہ سب کچھ بار کر بھی اس فتح و نصرت پر قانع تھا۔

مجھے معلوم ہوا کہ اس نے اپنے ایک بہت ہی کھاتے پیتے دوست کو جو ایک اونچے خاندان کا چشمہ و چراغ تھا۔ سردار کی محبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ سردار جہاں کی ہر خواہش کو اپنے دست کے ہاتھوں مکمل ہوتا ہوا دیکھے۔

میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ واضح ہے جو راستے اپنے لیے متعین کیے ہیں وہ اس کو ایسی ایسی اندھیوں کی گھاٹیوں میں لے جا سکتے ہیں جہاں نہ صرف ہاتھ کو ہاتھ سمجھائی نہیں دیتا بلکہ خود اپنے وجود اور عدم وجود کے احساس ہی میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ لیکن وہ ان دونوں مجھ سے نہیں ملا۔ اور نہ ہی میں نے اس سے ملنے کی اذیت برداشت کرنے کی کوشش کی۔

ایک رات وہ یکا یک آدھمکا۔ بہت سرد رہا۔ بہت خوش۔ میں نے کچھ نہ جاننے کے انداز میں پوچھا ”س“ سے تمہارا عشق کس منزلی میں ہے۔ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”یار کیا آؤٹ آف ڈیٹ آدمی ہے۔“

میں نے دانستہ حیرت کا اظہار کیا۔ ”کیا بات ہے، میں نہیں سمجھ سکا۔“
 ”بھئی س سے الگ ہوئے زمانے بیت گئے۔“

”اور تم ابھی تک زندہ ہو۔“

”ہوں۔ دیکھو بالکل ہوں۔ تمہارے سامنے ہوں۔“

اس نے میرے طنز کے سہ پر اس طرح تھوک دیا جیسے کوئی بات ہی نہیں بولی۔

”آخر کس موٹر پر رہ گئی بے چاری۔“

”موٹر پر نہیں منزل تک پہنچا آیا ہوں۔“

”تو گویا اس کی منزل اور تمہاری منزل جدا تھی۔“

”یس یہی سمجھو، سمجھتا تو یہی تھا کہ منزل دونوں کی ایک ہی ہے لیکن ایسا نہ ہو سکا

میں تو آگے نکل آیا ہوں۔“

”تو اب کہاں تک جاؤ گے۔“

”بس دیکھتے رہو۔“

”کسی نئی منزل کی تلاش ہے یا صرف چلتے رہنا ہی“ مقصد زندگی ہے؟۔“

”تلاش نہیں منزل متعین ہے۔ اسی کی جانب نگران ہوں اور قدم اٹھا

رہا ہوں۔“

میں نے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

باتوں کا یہ سلسلہ ویر تک چلتا رہا۔ پھر اس نے بتایا کہ دس نے بیچ وقت نماز

شروع کر دی ہے عشق کی ساری نئی پرانی داستانوں کا دفتر پارینہ جلا کر بھینک دیا

ہے۔ شہر کے کسی نامی پیر و مرشد کا مرید خاص ہو گیا ہے۔

میں نے اس تبدیلی کا مذاق اڑانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ پھر اس طرح شروع و ختم

ہے اپنے مرشد کا تذکرہ کر رہا تھا کہ اس کے اس اعتماد کو منزل کوئی نہ مانے گا۔

پھر وہ چلا گیا اور پھر ہی دن بس ایک دن مجھ سے رستے میں اس کی مٹھ بھیر ہو گئی۔
 میرے بچے بد اس نے بتایا کہ وہ مکہ مسجد سے نماز جمعہ ادا کر کے چلا آ رہا ہے۔
 مجھے پتہ نہیں اس کے گھر پر آج پھر وہ بشت کیوں نظر نہ آئی جو کچھ یہی دن قبل
 میں نے دیکھی تھی۔

”کیوں محنت تو ٹھیک ہے نا“

”ہاں“ اس نے اس انداز سے کہا جیسے میرا سوال ہی محل تھا۔

پھر وہی کہنے لگا۔ ”یار میں تمہارے پاس آنے ہی والا تھا،“
 میں نے پوچھا ”کیوں خیر تو ہے۔ کچھ کسی جگہ میں تو نہیں بڑ گئے؟“

”نہیں یار یوں است کہو۔ تم بعض وقت بڑا امانت آیتہ انداز اختیار کرتے ہو“
 میں نے اس قسم کی بات اس کی زبان سے پہلی بار سنی تھی محبت کے تعلق سے اس قسم کا
 اظہار خیال اس کی شخصیت کا ایک بالکل نیا پہلو تھا جو شاید اس پیری مریدی کا عطیہ ہو۔
 میں نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

”اچھا بھئی معاف کر دو۔ لیکن بتاؤ تو بات کیلئے“
 اس نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے کسی آیت کا ترجمہ کر رہا ہو۔

”مجھے اپنی ایک پیر بہن سے انس ہو گیا ہے“
 ”اور یہ انس بہت جلد محبت تک جا پہنچے گا۔“

”نہیں یار تم ہمیشہ کی طرح مذاق نہ اڑاؤ“

”حقیقت کا اظہار مذاق تو نہیں ہوتا“

”لیکن حقیقت کا انداز اظہار اتنا تلخ بھی تو نہیں ہونا چاہیے۔“

بچوں کہ ہمارے راستے مختلف تھے اس لیے ہم جدا ہو گئے۔ اور بات اس سے آگے نہ ہو سکی۔ ویسے میں نے اس کو رد کرنا بھی چاہا۔ لیکن وہ خود بڑی جلدی میں تھا۔ اس کے بعد دو ایک بار مجھ سے ملا تو مجھے معلوم ہوا کہ اپنی پیر بہن سے اس کا معاشرہ بڑی شدت اختیار کر گیا ہے۔ وہ بڑی پاک اور بے عیب محبت کر رہا ہے، ایسی محبت جو ٹھنڈا سایہ تو چاہتی ہے گھنا نہیں چاہتی۔ ایسی محبت جو نشہ تو چاہتی ہے دھندل نہیں چاہتی۔ ایسی محبت جو روح تو چاہتی ہے جسم نہیں چاہتی۔ میں بھلا اس سے کس طرح کہتا کہ اس کی شخصیت کی یہ نئی پنا گاہیں اسے راس آئیں۔ ایک بار یہی باتیں کرتے کرتے اس نے اپنی تھیلی میری طرف بڑھا دی۔ ”دیکھتے ہو؟“ میں نے کہا۔ ”نہیں میں پامسٹ نہیں ہوں۔“ لیکن اندھے بھی تو نہیں ہو؟“

”ادہ۔۔۔“ میری نظر تھیلی کے پچوں پہنچ اس داغ پر جم کر رہ گئی جو وہ مجھے دکھانا چاہتا تھا۔

”یہ جو داغ ہے نا اس میں مجھے چاند کی ٹھنڈی روشنی نظر آتی ہے۔ اور یہی روشنی اب میرا مقدر ہے۔“

”یار، میں تو رہتا تھا، نماز پڑھنے سے پیشانی پر سجدوں کے نشان ابھرتے ہیں لیکن تم نے تو ہتھیلی پر بہشت بنا دی۔“

وہ کچھ برہم ہو گیا۔ ”تمہیں اپنا یہ پرانا طور طریقہ چھوڑ دینا چاہیے۔“ میں نے اس کو سنا لیا۔ ”اچھا بھئی۔“ اب جو کبھی ایسی گستاخی کی تو دہی سزا دینا جو کبھی سچ کے شوہر نے تمہیں دی تھی۔“

وہ بے اختیار سنس پڑا۔ ”یار باز بھی آؤ اپنی شرابہ توں سے“
 میں نے اس کو بھینچ لیا۔ ”اچھا اب بتا بھی دو کہ آخر یہ نشان کسے کیا؟“
 اس نے مجھے بتایا کہ اپنی پیر بہن کے انکار پر اس کا دل جیتنے کے لیے اس نے
 اپنا پہلا نامہ محبت جو اس کی پیر بہن نے اس کو سخت سست کہہ کر لوٹا دیا تھا
 اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اس کے سامنے ہی آگئی لگائی تھی کہ اس کے ہاں کہہ دیئے تک
 وہ اسی طرح اپنی ہتھیلی کو جلاتا رہے گا۔ اور اس کی پیر بہن نے بے قرار و
 مضطرب ہو کر حامی بھر لی تھی۔ اور اس طرح ہتھیلی کا یہ داغ اس کی بے دارغ وخت
 کا جھلکا تا نشان بن گیا تھا۔

اس کے بعد پھر وہ بہت دنوں تک مجھ سے نہیں ملا تھا۔
 اور جب آج ملا تھا تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ قرآن سر پر اٹھا کر اس نے
 قسم کھالی ہے کہ وہ بچہ اس کا نہیں ہے۔
 اور اس کا گلہ نہ دھا ہوا تھا۔

اور میں سوچ رہا تھا کہ۔۔ آدمی زندگی بھر جھوٹ بول سکتا ہے۔ لیکن
 آنسو بھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔

پھر جب وہ انگوٹھی لے کر جارا ہوا تھا تب بھی میں نے محسوس کیا تھا کہ شاید وہ دودھ مار ہو۔
 اس کے بعد پھر وہ بہت عرصے تک مجھ سے نہیں ملا۔

اس سے بالکل غیر متوقع طور پر میری ملاقات اپنے ایک دوست کے کسی
 قریبی رشتہ دار کی شادی میں ہوئی۔

وہ بے حد مصروف تھا۔ شادی کے انتظامات اس قدر تن دہی سے کر رہا تھا کہ

دافعی اس کو منٹ بھر کی بھی فرصت نہ تھی۔

میں دور بیٹھا ہوا اس کو دیکھ رہا تھا۔ اپنے دوست سے جس نے مجھے مدعو کیا تھا۔ استفسار پر مجھے معلوم ہوا کہ دامن انھیں پیر دمر شر کی صاحبزادی ہیں جن کے ہاتھ پیر داصف نے بیعت کی تھی۔

داصف کی مصروفیت کا سبب روز روشن کی طرح میرے سامنے واضح اور عیاں تھا۔ وہ ایک گوشے میں کھڑا ہوا، انتظامی امور کے تعلق سے پہلیات دے رہا تھا۔ میں اٹھ کر اس کے قریب پہنچا تو اس نے مجھے دیکھا اور اس طرح بالکل اتفاقی ملاقات کی سرت میں مجھ سے معافہ کیا۔

میں اس کے پاس ہی کھڑا ہو گیا اور سرگرمیٹ جلا کر باتوں کا سلسلہ شروع ہی کرنے والا تھا کہ ایک چھوٹی ٹسی لڑکی جلدی سے آکر ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما گئی۔

اس نے بڑے اطمینان سے لفافہ چاک کیا۔ گلابی رنگ کا ایک کاغذ نکال کر بڑے اہتمام سے پڑھنے لگا۔

میرا جسم خواہ کسی کی ملکیت ہو، میری روح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ کی رہے گی۔ یہ انگوٹھی آج تک آپ کی نشانی کے طور پر میرے دل کے ساتھ رہی۔ اب اس کو آپ میری نشانی سمجھ کر اپنی انگشت شہادت کی زیرت بنائے رکھیے۔

خیر تک آپ کی

”بڑی صاحبزادی“

اس نے جب ٹھنڈی آہ بھر کر انگوٹھی نکالی تو میں پہلی نظر ہی میں پہچان گیا کہ یہ وہی انگوٹھی ہے جو نہ صرف میری اپنی ملکیت ہے بلکہ میری سنگیت کی نشانی ہونے کے ناطے سے میرا جذباتی لگاؤ بھی جس سے وابستہ ہے۔ لیکن اس وقت میں نے اس طرح نظریں پھیر لیں جیسے انگوٹھی کو میں نے دیکھا ہی نہیں۔
 داصف خود تجھ سے مخاطب ہوا۔ ”پہچانتے ہو اس انگوٹھی کو؟“
 میں بس دیکھتا ہی رہ گیا کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ پھر خود ہی کہنے لگا۔
 ”یار، ابھی رہنے دو میرے پاس، دو ایک دن میں لوٹا دوں گا۔“
 خط اپنی جیب میں رکھتے ہوئے اس نے بڑے فخر سے مجھ سے پوچھا ”جانتے ہو۔ یہ خط کس کا ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔
 کہنے لگا۔ ”پیر دشت کی بڑی صاحبزادی کا۔“
 ”آج انھیں کی تو غالباً شادی ہے۔“ میں نے مکرر تصدیق چاہی۔
 ”ہاں بھئی۔۔۔ دہن بن گئی ہیں لیکن مجھے بھولنے میں اب تک کامیاب نہ ہو سکیں۔ تم نے تو اپنی انکھوں سے خط دیکھ لیا نا۔“
 پھر وہ مختلف لوگوں کو کچھ ہدایات دینے لگا۔
 میں آہستہ سے اس کے پاس سے کھسک آیا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے اس کے ساتھ اب ایک لمحہ گزارنے کے خیال سے بھی وحشت سی ہو رہی تھی۔
 شادی سے لوٹنے لگا تب بھی اس سے ملاقات نہ ہوئی۔ وہ کسی کام سے اندر زنان خانے میں چلا گیا تھا۔

پھر دقت کا ایک لمبا دریا اس کے اور میرے درمیان حائل ہو گیا۔
وہ اب میری طرف بالکل نہ آتا تھا۔

میں نے اپنی شادی میں بذریعہ رجسٹری بطور خاص اس کو رقعہ بھیجا۔
وہ پھر بھی نہ آیا۔

اپنی رنگارنگ نئی زندگی کے سبھانے اور سنوارنے میں، میں پھر کچھ اس
طرح لگا کہ اسے بھول بھال گیا۔

ایک دن راستے پر مجھے کسی جانی پہچانی آواز نے مخاطب کیا۔ میں نے
ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ کوئی نہ تھا۔ آگے بڑھنے لگا تو بالکل برابر سے کسی
نے میری بائیںہ بکڑ لی۔

”اوہ باتم ہو، یہ میں ریش دبدوت“

میں بدقت تمام اس کے اس حلیے کو پہچان سکا۔

داڑھی میں اس کا چہرہ کچھ ذریعہ ضرور ہو گیا تھا۔

اس نے کہا: ”اب میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ چلو، تمہیں تمہاری بھابی

سے ملاؤں“

میں نے شکایت کی۔ ”شرم آئی چلے۔ الگ الگ شادی کرنی پڑے۔“

تک نہ کیا۔ اور پھر میری شادی میں بھی نہیں آئے۔“

اس نے معافی چاہی۔ کہنے لگا: ”کیا بتاؤں کیسے کیسے انقلابات زندگی

میں آئے ہیں۔“

میں نے کہا: ”وہ تو تمہارے چہرے سے ہی ظاہر ہیں۔“

”دہ مجھے گھسیٹنے لگا۔“ چلو بھئی۔“

”بھئی آخر رہتے کہاں ہو۔“

”یہیں۔۔۔ سائے، اسی ڈیوڑھی میں۔“

”کیا یہ سسرال ہے بھاری؟“

”سسرال نہیں۔ میرا اپنا گھر سمجھو۔ یہ بات دراصل یہ ہے کہ۔۔۔ تمہیں

سنا تو یاد ہے نا۔“

”ہاں ہاں ابھی طرح یاد ہے۔“

یہ اسی کے میاں کی ڈیوڑھی ہے۔ بس یہیں میں بھی اپنی بیوی سمیت رہتا

ہوں۔۔۔ دوست ہویا تو ایسا ہوں۔ ایک پل میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا

کیا نفیس آدمی ہے۔ سرتابہ قدم محبت ہی محبت۔ اس سے زیادہ میری اپنی

حکومت اس گھر پر چلتی ہے۔ سن بھی مطمئن ہے اس کا شوہر بھی۔ مجھے بھی ہر طرح

کا اطمینان حاصل ہے۔ بس اپنی کتب زیر مطالعہ رہتی ہیں۔ اس کے سوا مجھے

کوئی کام نہیں۔ یہی لوگ میرے کفیل ہوتے ہیں۔ بڑا خدارسیہ آدمی ہے۔“

ایک سانس میں اس نے اتنی ساری باتیں کہہ دیں۔

باتیں کرتے کرتے ہم ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے۔ زنانہ دروازے پر

پہنچ کر میں رک گیا۔ تو اس نے پھر بانہہ پکڑ کر مجھے کھینچا۔ ”چلو آؤ بھئی۔ تم سے

جھلا کون پردہ کرے گا یہاں۔“

صحن سے ہو کر دیوان خانے میں پہنچے تو بیٹھے ہوئے لوگ ایتادہ ہو گئے۔

”ان سے ملو یہ میرے کرم فرما۔ میرے جگر کی دوست، میرے محسن،“

یہ ان کی بیوی — اور یہ میری بیوی — پیر و مرشد کی چھوٹی صاحبزادی ہیں۔ حضرت نے مجھے فرزندگی میں قبول فرمایا ہے۔“
 و اصف کی بیوی نے سلام کیا تو اس کی انگلی میں انگوٹھی جکڑ رہی تھی۔
 میں نے انگوٹھی سے پھر نظر میں پھیر لیں۔

میں لوٹنے لگا تو گیٹ کے باہر تک وہ مجھے چھوڑنے آیا۔ میں نے
 کہا ”یار تمھاری اس پیر بہن کا کیا ہوا۔ تم نے پھر کبھی کچھ بتایا ہی نہیں۔“
 وہ کچھ بوکھلا سا گیا۔

بات بدل کر اس نے کہا۔

”س کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے۔ ہے نا، ہرگز ایمان و آگاہی“
 سرگوشی کرنے کے انداز میں جھک کر مجھ سے کہنے لگا۔ ”اب بھی کبھی کبھی

ملفت ہو جاتی ہے۔“

”اف“ میں جیسے گرتا گرتا سنبھل گیا۔ جب ہوش بجا ہوئے۔

تو میں نے پھر پیر بہن کا تذکرہ چھیڑا اور انداز سے برگولی چلا دی جو
 ٹھیک اس کے سینے پر لگی۔

”شر ماؤ نہیں یار مجھے معلوم ہو چکا ہے۔“

”پھر کیا تم یہ چاہتے ہو کہ مکرر اپنے جرم کا اقبال مجھ سے کروائیں۔“

”نہیں بھئی۔ میں نے تو بس یو نہی تم سے پوچھا تھا۔“

”کیا بتاؤں یار۔ میں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے سے اپنے

عقد میں لینا چاہتا تھا۔“

”پھر کر کیوں نہیں لیتے عقد؟“

”یارِ قسم بھی عجیب آرٹ آف ڈیٹ آدمی ہو۔ اس نے تو انہیں دلوں
خودکشی کر لی۔ لیکن میں اب بھی ہر جمعہ کو اس کے نام پر ختم قرآن کر داتا ہوں۔“
مجھے ایسا معلوم ہوا کہ داحضہ اپنی پسر بہن کی قبر پر بیٹھا اسی قرآن کا ورد
کر کے اس کے نام پر بخش رہا ہے جس قرآن کو سر پر رکھ کر اس نے کبھی
قسم کھائی تھی کہ وہ بچہ اس کا نہیں ہے۔

چور

میں اس لیے ادا اس نہیں ہوں کہ شہر کی وہ جانی پہچانی سڑکیں، وہ مانوس گلیاں جو دن کو اپنے اجالوں اور شب کو اپنے اندھیروں سمیت میرے قدموں کے نیچے بکھی رہتی تھیں اب میرے قدموں کی چاپ کو ترسیں گی ان کے لمس کو ترسیں گی۔

میں اس لیے ادا اس نہیں ہوں کہ میرے وہ ساتھی جن کے قدم بہ قدم میں نے زندگی کی جدوجہد میں حصہ لیا ہے اب میرے اپاہج ہو جانے کے باعث مجھے پھوڑ کر آگے نکل جائیں گے۔

میں اس لیے ادا اس نہیں ہوں کہ اس حادثے نے میری ساری ہستی کو اٹھل پھل کر کے رکھ دیا ہے۔ میرے ماضی کی مضبوط جڑیں میرے حال کی سنگلاخ زمین کے کھر درے سینے میں بے طرح ہل کر رہ گئی ہیں اور اب

میرے مستقبل کی چمکدار دھرتی پر ان کے بارے میں پانے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔
 میں اس لیے ادا اس نہیں ہوں کہ مجھے ڈاکٹر دُن نے ابھی نہیں بتایا کہ میرے
 بیدار ذہن کی جلتی ہوئی نو بجھ نہیں جائے گی، میری عمیق آنکھوں کی شریر
 کہیں سرد نہیں پڑ جائیں گی۔ میرا تارِ نفس، میری زندگی کا رشتہ، اسید
 ٹوٹ نہیں جائے گا۔

میں اس لیے بھی ادا اس نہیں ہوں کہ تم اب بھی نہیں آئی ہو۔ مجھے علم ہے
 کہ جو جدائی تمھارا اور میرا مقدر ہے اس کے ناطے میں اب ان راستوں کا
 تصور ہی نہ کروں جن راستوں پر چل کر تم میری پہونچنا سے بہت دور نکل گئی ہو
 اور میں جن راستوں پر آگے بڑھ رہا تھا ان کی سمت اتنی خستہ تھی کہ میرا ہر قدم
 تم سے مجھے اور دور اور دور کر رہا تھا۔

تمھارا ذکر اب میری زندگی سے صرف اس قدر وابستہ ہے جیسے بے آب
 گیاہ جنگل میں، کھڑی دوپہر کے وقت، بے برگ دیوار پیڑ کے نیچے کسی ٹھکے ماند
 پیلے سا فرکا وجود۔ جو بھری بہاروں کا تصور کیے بیٹھا ہو۔

لیکن اس کے باوجود۔ تمھارا ذکر پھر تمھارا ذکر ہے۔ اور میری زندگی
 اب میری زندگی نہیں۔

پھر اب میرے پاس اس اداسی کا سبب رہ ہی گیا جاتا ہے۔ لیکن
 اس کے باوجود میں ادا اس ہوں۔

بڈنمبرہ پر میں نے جب آنکھ کھولی ہے تو مجھے علم نہیں ہوا کہ میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔
 بڈنمبرہ پر جب میں نے اپنی آنکھیں دیر تک کھلی رکھنے کے بعد بند کر لی ہیں اس وقت

مجھے اس سہا ہوا جیسے میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ اور میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔
دوڑتا ہوا موٹر، ٹکراتا ہوا سائیکل جس پر میں سوار ہوں۔ دوڑتا ہوا
موٹر، ٹکراتا ہوا سیکل۔ دوڑتا ہوا موٹر، ٹکراتا ہوا سیکل۔

اور جب مجھے موت کی گہری کھانی سے زندگی کے پیرنگ کر لیا ہے تو میں بہت
ہی سہا سہا زندگی کے پیچھے پیچھے پیر دبا کر، سنبھل سنبھل کر بڑی ہی احتیاط سے
چل رہا ہوں کہ مبادا اس کو میری کوئی حرکت ناگوار گذرے اور وہ قدم
بڑھا کر آگے نکل جائے اور میں دپک کر اس کا دامن بھی نہ تھام سکوں۔

میری صرف پلکیں ہل رہی ہیں۔ میں صرف آنکھیں جھپک رہا ہوں۔ اجالے
اور اندھیرے آپس میں مدغم ہو رہے ہیں۔ پھر جدا ہو رہے ہیں۔ میں سمجھی
آنکھیں پہچان رہا ہوں، کبھی نہیں پہچان رہا۔ یہ اجالا ہے۔ یہ اندھیرا ہے۔
یہ اجالا اور اندھیرا دونوں آپس میں مل گئے ہیں۔ پتہ نہیں یہ کیا ہے۔ وہ
کیا ہے۔

اب، جب کبھی میں اجالے کو پہچان لیتا ہوں، وہاں ایک چہرہ بھی مجھے دکھائی
دیتا ہے۔

میری صرف پلکیں ہل رہی ہیں۔ میں صرف آنکھیں جھپک رہا ہوں۔
اب اجالے ہی اجالے میرے اطراف پھیل گئے ہیں۔

اب نہ ان اجالوں کو میں جھٹلا سکتا ہوں۔ نہ اس چہرے کو جو اندھیرے
میں ڈوب ڈوب کر ابھرتا ہے۔

”آپ نے پہچانا مجھے؟“

بالآخر اس کو میں نے پہچان لیا۔ وہ بھی صرف اس حد تک کہ اس کا چہرہ میرے لیے نامانوس نہیں ہے۔ وہ مریضوں کا یونی فارم پہنے ہوئے تھا۔ پھر اس نے اپنے تعلق سے مجھے بہت کچھ بتایا۔

کبھی وہ اور میں ایک ہی اسٹیشن پر آسنے سامنے کی بیچوں پر کئی رات سو چکے تھے اجالوں کے ساتھ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے تھے، اندھیروں کے ساتھ ہم ایک دوسرے کے مقابل اپنی پہنچ سنبھال لیتے تھے میں نے کبھی اس سے قرب کی کوشش نہیں کی۔ اس نے کبھی مجھے لائق اعتناء نہیں سمجھا۔

پھر ہم ایک دوسرے سے اس طرح جدا ہو گئے جیسے کوئی راہ گیر سگریٹ جلانے کے لیے دوسرے راہ گیر کا ایک تیلی کا احسان اٹھا کر محبوب محبوب جدا ہو جاتا ہے۔

مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ کس نے کس سے تیلی مانگی تھی اور کون کس کا محسن ہے۔ وہ دن میں کتنے ہی بار اپنے بستر سے میرے پلنگ تک آتا رہا۔ مجھ سے کتنی ہی باتیں کیں مجھے قلبیاں دیں۔ میرے تعلق سے جھوٹ موٹ ہی اکسہ سیکشن کی امید افزا رپورٹ کا ذکر کیا۔ میرے جلتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ میری پسینے سے تریشانی سے چھٹے ہوئے بال درست کیے۔

اس کے باوجود میری آنکھیں اس کے چہرے سے ہٹ کر کچھ تلاش کرتی رہیں۔ میں نے اس سے پوچھا: یہاں ملنے والوں کی آمد کا وقت کب ختم ہوتا ہے۔ میں نے جس وقت اس سے یہ سوال کیا ہے اس وقت مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا جواب دے گا۔ لیکن میرا دل موس رہا تھا ایک ایسا غم آہستہ آہستہ میرے

وجود پر قبضہ کر رہا تھا جس غم کا میں کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ میرے دائرہ کے سارے پنگوں، سارے بستروں کے اطراف کراہتی اور سسکتی ہوئی زبانوں کو دلاسہ دینے کے لیے مسکراتے، ہنستے، شاداں و فرحاں چہرے بھی جمع ہو گئے تھے، مغموم اور ادا اس چہرے بھی۔۔۔ لیکن میرے پاس سوائے اس کے اور میری اپنی اداسیوں اور محرومیوں کے کوئی نہیں تھا اور اس کے پاس تو پتہ نہیں اس کی اپنی اداسیاں اور محرمیاں بھی تھیں یا نہیں۔

”ملنے والوں کا وقت اب ختم ہوا چاہتا ہے۔ آپ کو شاید اس ہنگامے سے اکٹھن ہو رہی ہے۔

میں نے اس کو جواب میں کچھ بھی نہ کہا۔ لیکن میری آنکھیں بڑی کس پیرسی کے عالم میں ایک ایک چہرے کو تک رہی تھیں۔

وہ کیوں نہیں آیا۔

وہ بھی تو آ سکتے تھے۔

اور ہاں وہ بھی تو۔

لیکن کوئی بھی تو سہوے لیے نہیں آیا تھا۔

ہاسپٹل کے باہر بکھری ہوئی شام کی اداسیاں رات کی پھیلی ہوئی سیاہ پیاد میں سمٹ رہی تھیں۔

ہاسپٹل کے باہر رات کا اندھیرا تھا۔

ہاسپٹل کے اندر بجلی کی روشنیاں۔

لیکن ہاسپٹل کے باہر ٹھہری ہوئی رات کا اندھیرا میرے اطراف پھیلی ہوئی

بجلی کی روشنی سے پنج پنج کر چھپ چھپ کر جانے کس طرح میرے سینے میں داخل ہو رہا تھا۔
 ”کیا مقدار اس کیوں ہو گئے ہیں بہت۔ اُس نے آخر مجھ سے بوجھ ہی لیا۔

”آپ اس قدر اس کیوں ہو گئے ہیں بہت۔ میں نے اس کے سوال کو
 نظر انداز کر کے اسی سے سوال کیا۔

”وہ سکرایا بلکہ قریب قریب سنس پڑا۔ پھر کہنے لگا۔
 ”تھانگتی اور دوڑتی ہوئی زندگیاں، ہمیشہ بھول اور مضمحل زندگیوں کو پیچھے
 چھوڑ دیتی ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ لیکن پیچھے پاٹ کر کبھی کبھی دیکھ لینے میں بھی تو کوئی حرج
 نہیں۔“

”ہاں۔ لیکن کون دیکھتا ہے۔“

”جو نہیں دیکھتے ہیں ان کا سوال نہیں۔ لیکن جنہیں نہیں دیکھا جاتا وہ تمنا تو
 کر سکتے ہیں۔“

”یہ تمنا ہی پوری نہ ہو تو ایک اور راستہ بھی نکل آتا ہے۔“ اس نے بہت ہی
 رکتے رکتے یہ بات کہہ دی۔

”میں سمجھا نہیں۔ میں نے کہا۔“ میرے ذہن میں کوئی ایسا راستہ نہیں ہے۔“
 ”یہی کہ ہم خود دوسروں کی تمنا بوری کریں۔ بالکل اس طرح جیسے آنکھیں
 بند کیے خند کو منا رہے ہوں۔“

”تو آپ ہی سب کچھ میرے ساتھ بھی کر رہے ہیں؟“
 ”میں بالکل آپ کے ساتھ کچھ نہیں کر رہا ہوں۔ آپ نے فی الواقع نہیں سمجھا۔“

میں کہہ چکا ہوں۔

— اور اس کے بعد ہم ایک دوسرے کے دست ہونگے۔

پھر میں نے اس کو ہمیشہ تم کہا اور اس نے مجھ کو۔

دوسرے دن شام کو جب ملاقاتیوں کا وقت شروع ہوا تو کہتے ہی

جانے پہچانے پہرے میرے اطراف تھے۔

کوئی مجھ سے کل کے نہ آکنے کی معافی مانگ رہا تھا۔

کوئی مجھے یقین دلا رہا تھا کہ اسے آج ہی معلوم ہوئے۔

کوئی مجھی سے پوچھ رہا تھا کہ ڈاکٹروں نے کیا کہا۔

کوئی حادثے کی تفصیلات جاننا چاہتا تھا۔

میں اتنے بہت سارے پوچھنے والوں کو دیکھ کر خوش ہی نہیں ہو رہا

تھا نیز محسوس کر رہا تھا۔ انھیں سب میں وہ بھی تھا۔

کبھی مجھے دیکھ رہا ہے، کبھی سرے دیکھنے والوں کو اور ایک مستقل سکڑا

اس کے ہونٹوں پر اس طرح پھیلی ہوئی تھی جیسے کسی نئی نویلی دہن کے لبوں

پر سی کی دھڑی۔

پھر وہ کہیں غائب ہو گیا۔ جب سب لوگ جا چکے تو میری آنکھیں اس کی

استلاشی تھیں۔

آج ہاسپٹل کے یا ہر شام کی ادائیگی بھری ہی نہیں بلکہ شاید شام

ہی نہیں ہوئی۔

آج ہاسپٹل کے باہر رات کا اندھیرا جانے کب پیر و باکرہ آیا اور کھڑکیوں

سے جھانکتی ہوئی روشنیوں سے نظر بچاتا کچ کچ میں پھپھتا پھرا —
 ”آج تو تم مطمئن ہونا“ وہ میری باتیں سے نمودار ہوا۔
 ”کیوں؟“ میں نے دانستہ پہلو تہی کی۔

”آج جو اتنے بہت سارے لوگ تم سے ملنے چلے آئے تھے“
 مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اس کا قصور دار ہوں۔ اور کل جو اس سے
 میری باتیں ہوئی ہیں اس کا احساس میری سرتوں پر کچھ اس انداز سے پہرے
 بٹھا رہا ہے کہ میں رفتہ رفتہ اپنے ملنے والوں کی آمد پر خوش بھی نہ ہو سکوں گا۔
 لیکن رفتہ رفتہ خود میرے ملنے والوں ہی نے نہیں دوست احباب نے
 بھی آنا چھوڑ دیا۔

— اور اب میں بالکل اس کے حوالے ہو کر رہ گیا۔

اس کے دائیں پاؤں میں لنگ تھا اور اس کا بایاں ہاتھ سرے سے تھا
 ہی نہیں۔ ڈاکٹر دن نے اسے اجازت دے رکھی تھی کہ وہ دوا خانے کے پائین
 باغ میں صبح و شام چہل قدمی کرے۔ یہ چہل قدمی اس کے معذور پیر میں خون کی
 گردش اور روانی کے لیے ضروری تھی۔ وہ ویسے بھی دن بھر اپنے بستر پر کم
 ہی رہتا۔ صبح صبح وہ باغ میں چہل قدمی کر کے لوٹتا تو اپنے بستر کے پاس ناشتہ
 مل جاتا۔ اس کے بعد وہ دارو دار دگھوم کر ان سب کی خیر خیریت پوچھ آتا
 جن سے ہاسپٹل میں وہ دلچسپی لینے لگا تھا۔ اور اس خیر خیریت پوچھنے کا آغاز وہ
 بڈ نمبر ۵ کے مریض سے یعنی مجھ سے کرتا۔ یہ اس کی اپنی دانست میں آنکھیں
 بند کیے ہوئے تیند کو مٹانے کی ادالتھی۔ اور یہ ادایتہ نہیں اس کو کس قسم کا

آرام بخشی تھی۔ میں تو صرٹ اتنا جانتا تھا کہ آنکھیں کھول کر سو نے کا یہ سلیقہ اس لیے اسے آگیا ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے جاگتے رہنے کا سلیقہ بھی جانتا ہے میں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ کوئی اس کا اپنا حال احوال پوچھنے کے لیے اس کے بستر تک آتا ہو۔ وہ دوسروں سے ہمدردی کر کے ان کی تمنا پوری کرتا ہوگا یا خود اپنی۔ لیکن اس کے خلوص اور محبت کے تعلق سے اس طرح سوچنا بچے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔

اگر یہ اس کی اپنی تمنا ہی تھی تو کیسی چھوٹی ٹیسی تھی یہ تمنا، کتنی ننھی سی، کو مل سی اتنی سی۔ پھول کی پنکھڑی کی مانند۔ ہوا کے ایک تازہ جھونکے کی مانند۔ چھوٹی سی ایک سیپ کی مانند جس کے اندر کوئی گُوہر نہیں ہو۔ اس ننھے سے دیے کی مانند جو اندھیری رات کو کسی وسیع و عریض جنگل میں ٹمٹما رہا ہو۔

بھلا اس فراس روشنی سے راستہ پاسکیں گے؟۔

وہ ادھر ادھر جکر کاٹ کر پھر میرے پاس آجاتا۔

آئس کریم۔ شلٹری۔ موسمی۔ انجیر کچھ نہ کچھ میرے لیے آتا۔

میں کچھ تکلف سے کام لیتا تو وہ برہم ہو جاتا۔ وہ جب کبھی آئس کریم

لے آتا تو میں تکلف کم ہی کرتا۔ اور وہ بڑے چاؤ سے میرے کھلے ہونٹے منہ میں

چچے بھر بھر کے ڈالتا رہتا۔ پہلے چچے پر ناگوار ٹھنڈک کے احساس سے جب میں

منہ بناتا تو وہ بڑا محفوظ ہوتا اور میرے ساتھ ساتھ خود بھی منہ بنا کر میری نقل کرتا۔

ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگا۔ ”کاموں میں کہتا تھا تا کہ تم اس لونڈے کے

تعلق سے غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہو۔ وہ بڑا نیک لڑکا ہے۔“

”پھر کون ہو سکتا ہے تمہارے اپنے خیال میں؟“

”میرے اپنے خیال میں تو میں ہی ہو سکتا ہوں۔“

”نہیں یا تم مدد کرو میری۔“ مذاق بہت ہو چکا۔

”تم رپورٹ کیوں نہیں کر دیتے؟“

”میں چاہتا ہوں خود اس دلچسپ آدمی کو پکڑوں۔ کبھی کبھی یہ بھی سوچتا ہوں کہ اس سلسلہ کو جاری ہی کیوں نہ رہنے دوں۔ ایسی کون سی بڑی رقم

لے جیتا ہے وہ۔“

”پھر بھی یا روزانہ کانٹکس جو لگ گیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ایسا کون سا بڑا کانٹکس ہے۔ ہو گا کوئی ضرورت مند۔“

”چار آنے سے زیادہ لیتا ہی نہیں وہ؟“ اس نے پوچھا۔

”اسی نہیں کبھی نہیں۔ آپ دنیا بھر کی دولت سمیٹ کر رکھ دیجئے وہ

ایک چوتھنے لگے گا۔ آپ صرف پونئی رکھ دیجئے۔ وہ پونئی لے لے گا۔“

”تم نے زیادہ سے زیادہ کتنے پیسے تکیے کے نیچے رکھے ہیں۔“

”۲۱ روپے ساڑھے بارہ آنے۔“

”اور جب صبح ہوئی۔“

میں نے بات کاٹ کر جملہ پورا کیا۔ ”تو صرف چار آنے غائب تھے۔“

”پہلے یہ بتاؤ تمہیں اس لڑکے پر شبہ کیوں ہوا۔“

میں نے اس کو بتایا کہ جس رات یہ لڑکا میرے بلینگ کے برابر والے بستر پر

ایگیا تھا اس کے پہلے ہی دن اس نے مجھ سے دو آنے مانگے جو میں نے اس کو

دے دیے۔ دوسرے دن اس نے پھر مانگے۔ میں نے پھر دے دیے۔
تیسرے دن اس نے پھر اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں بند کر کے ہاتھ پھیلا
دیا تو میں نے اس کو ڈانٹا کہ اس طرح مانگنا بری بات ہے۔ بس اس کے
دوسرے ہی روز سے چار آنے کا ٹکس لگ گیا مجھ۔

”اور کیا پھر اس نے کبھی پیسے نہیں مانگے؟“

”ہاں یہ بات تم نے ٹھیک کہی“ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر مجھے خیال آیا
کہ درحقیقت بار اس نے مانگے تھے۔ لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔ یہی بار
میں نے اس کو بتلا دی۔

”تھیرت ہے؟“ اس نے تعجب کا اظہار کیا۔

”لیکن تمہیں کیوں اس کی پارسائی کا یقین ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

صبر نہ مجھے ہی نہیں۔ دوسروں کو بھی ہے اور تم سنو گے تو تمہیں بھی
ہو جائے گا۔

فطری طور پر میں نے تجسبی لی اور اس نے مجھے بتایا کہ نومبر ۱۹ کے مریض نے
دس روپے اور کچھ ریزنگاری ہاتھ و دم میں چھوڑ دی تھی جو اس روکے کے ہاتھ لگی
اور اس نے متعلقہ نرس کے توسط سے اس تک پہنچا دے۔

میں نے چھوٹے ہی کہا۔ ”اس میں یقیناً چار آنے کم ہوں گے۔“

وہ ہنسا، یا تم بھی کمال کرتے ہو۔ کم ہوتے تو وہ شخص بار پر سن نہ کرتا۔

کوئی ضرر دہی نہیں ہے۔ وہ یہ جان کر بھی خاموش ہو سکتا ہے کہ چار آنے
کی کمی کا اظہار خود اس کی اپنی پوزیشن کو خراب کر دے گا۔ لوگ یہی سوچیں گے کہ

لڑکے کی شرافت پر اس کو کچھ فوانے کی بجائے اٹے چوری لگا دی۔
 ”بھئی خوب دودھ کی کوڑی لائے ہو۔“

میں مسکرا کر خاموش ہو رہا۔

اس دن سے وہ بھی اس لڑکے پر نظر رکھنے لگا۔

ایک دن وہ میرے لیے میرا مرغوب پلم کیک لے آیا۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے
 کر کے پلیٹ میرے سامنے رکھ دی۔ اور دنیا بھر کی باتیں کرتا رہا۔
 میں نے اس کو بتایا کہ آج ٹکس مجھے معاف کر دیا گیا۔
 ”چلو گھٹی ہوئی؟“ وہ پہننے لگا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے کہا۔ ”یہ کچھ زیادہ“

اچھا بھی نہیں ہوا یا ر۔“

”کیوں۔“ میں نے پوچھا۔

”اس لیے کہ رازدراز ہی رہ گیا۔ جو انشا ہو جاتا تو اچھا تھا۔“

”یہ بات تو ہے۔“ میں نے بھی اپنا اشتیاق ظاہر کیا۔

لیکن دوسری صبح پورے آٹھ آنے غائب تھے۔ اور کچھ لٹکس بھی گویا اس
 طرح وصول کر لیا گیا تھا۔

میں نے اس کو بتا دیا اور ہم دونوں بہت دیر تک پہنتے رہے۔

اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ آج وہ اس بات کا پتہ چلا کر ہی رہے گا۔ خواہ

اسے رات بھر جاگنا ہی کیوں نہ پڑے۔

رات خود میرے پلنے تخت الشعور نے شاید مجھے ٹھیک سے سونے نہیں دیا۔

لیکن چور کا پتہ چلانے میں ہم دونوں ہی ناکام رہے۔

دن کو وہ حسب معمول آیا تو چاکلیٹ کا آئس کریم بار بڑی احتیاط سے پلاٹک
کچھ ٹٹے سے لفافے سے نکال کر اس نے میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔

میں نے کہا: ”یار تمھاری اتنی ساری محبتوں کا بدلہ کس طرح چکا سکوں گا؟“
وہ بڑی مصومیت سے شرمایا۔ کہنے لگا، ”نہیں یار تم ایسی باتیں مجھ سے
مت کیا کرو۔ تمھاری اس غیریت سے مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ اور تم بہتہ نہیں
مجھے کیا کیا سمجھتے ہو۔ میں اتنا اچھا آدمی بھی نہیں ہوں۔ تمہیں بتا دوں۔۔۔
بتا دوں تمہیں؟۔۔۔ پھر وہ کچھ دیر خاموش رہا۔

پھر کہنے لگا، ”خیر پھوڑو۔“ لیکن یار جی چاہتا ہے تم سے پیٹ کر خوب ردلوں۔
مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ میں نے پھر اس سے پوچھا: ”تم کچھ کہتے کہتے کیوں رک
گئے؟۔۔۔“

”نہیں ایسی کوئی خاص بات بھی تو نہیں ہے۔“

”آخر کہو نا۔“

”میں کل جا رہا ہوں۔ کل دسپارچ کر دیا جاؤں گا۔“

میں نے نرس کو بلا کر اس بات کی تصدیق کی۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ
جب میں زخمی ہو کر آیا تھا تو اس نے اپنا پلنگ میرے لیے خالی کر دیا تھا اور
اور بڑی خوشی سے خود نیچے رہنے پر رضامند ہو گیا تھا۔

اور وہ دوسرے دن چلا گیا۔

آج پھر میرے دل کا عجیب حال ہے۔ میں اس روز بھی اتنا ادا نہیں
تھا جس روز کس مہر کی کے عالم میں پہلے دن ہاسپٹل میں پڑا تھا اور مجھ سے ملنے

کے لیے کوئی نہیں آیا تھا۔

میری آنکھیں مجھے یاد نہیں ایسے میں کبھی بھنگی تھیں جب کہ کوئی جدا ہوتا ہی
بھر آج مجھے یہ کیا ہو گیا ہے۔

جی چاہتا ہے وہ آئے اور میرے منہ میں آئیں کہ ہم ڈال کر خود منہ بنا
اور میری نقل اتارے۔

وہ مسرت ہو اس کو ایسا کرنے میں حاصل ہوتی تھی۔ مجھے اندازہ ہو رہا کہ
جدا اسل وہ میری اپنی مسرت بھی تھی۔

اور اب شاید اس نے اپنا یہ فرض میرے سپرد کر دیا ہے کہ میں آنکھیں بند
کیے ہوئے نین کو سناتا رہوں۔

دوسرے دن میں نے دیکھا، پیسے برابر تھے۔ وہ مجھے یاد آیا۔

تیسرے دن میں نے دیکھا، پیسے برابر تھے وہ مجھے بے طرح یاد آیا۔

چوتھے دن میں نے دیکھا، پیسے برابر تھے، وہ آئینہ جو میں نے اس کے جلتے
وقت اپنی آنکھوں میں بدقت چھپا رکھے تھے وہ آج تکیے کے نیچے پڑی ہوئی زیر کاری
پر گر گئے ہیں۔

نچا ہوا الیم

یہاں ایک چھوٹی سی احاطے کی دیوار تھی۔ یا پھر ہری بھری ترشی ہوئی
 باڑھ تو تھی ہی، ادھر یہ دیوار یا باڑھ پکی سڑک سے متصل تھی لیکن آج سڑک پکی ہو گئی
 ہے، اور احاطے کی دیوار یا احاطے کی باڑھ کچھ بھی نہیں رہی ہے تو ایسا معلوم
 ہوتا ہے کہ مسافر بنگلے کو سڑک کے قریب سے زمانے نے جبراً گھسیٹ کر دور کر دیا۔
 موٹر آگے بڑھ گیا تھا تو میں نے اس مقام کو پہچانا بھی نہیں، پھر کسی نے
 بریک لگا دی۔ وہ یاد جو چھپی ہوئی نہیں میرے دل و دماغ میں سو رہی تھی
 بروقت چونک کر اٹھ بیٹھی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی مسافر عین اس وقت
 سفر میں بیدار ہو جاتا ہے جب کہ ٹرین اس کی منزل سے آگے گزر رہی ہوتی ہو۔
 پچھلی جیب کار کے ایک شکاری نے مجھے ٹوکا جس نے ددنا لی بند دق اپنے
 کندھے پر رکھ لی تھی، ادھر سے پر اتنے ٹوٹے آدیناں کیے ہوئے تھا کہ انھیں دیکھنے

سے گھائل ہرنیوں کا خیال آتا تھا، پتھرائی آنکھوں کا خیال آتا تھا، ایک بھکی کا خیال آتا تھا، ایک اکھڑتے ہوئے سانس کا خیال آتا تھا۔ اور میں نے اطران یادوں کی جو رنگارنگ محفل سجا رکھی تھی وہ ان تصورات کی تھیں نہ ہو سکتی تھی۔

میں نے اس سے ٹی سے کہا۔ ”بریک میں نے نہیں دکائی؟“

”پھر آپ ہی تو کار چلا رہے تھے؟“

”مجھے کب انکار ہے، لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو کار چلا رہا ہو بریک لگانا

بھی اسی کے پس میں ہو۔“

وہ مسکرایا۔ کہنے لگا۔ ”کیا بات ہوئی؟“

”بات یہ ہوئی، کہ کار چلاتے وقت آپ کار یہی کی طرح سٹرک پر نہیں ہوتے

ہیں۔ آپ کا ذہن آپ کو کہاں کہاں لیے پھرتا ہے۔ جس منزل کے لیے آپ

ردانہ ہوتے ہیں، اس منزل کو کبھی آغاز سفر سے پہلے ہی جلیتے ہیں۔ اور جب

منزل پر پہنچتے ہیں تو منزل ہی کے تصور میں منزل پہچانی نہیں جاتی۔ ایسے میں

کوئی چپکے سے نکلی آتا ہے جو کہیں دل میں بچپا ہوتا ہے اور بریک لگا دیتا ہے

۔ بتائیے، وہ بھی تو میں ہی ہوتا ہوں جسے خود میں بڑی مشکل سے پہچان پاتا ہوں

وہ مسکرایا، کھسک کر اس نے کہا۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں رات کے

سنائے میں، غنودگی کے عالم میں آر۔ ٹی۔ ڈی کی بچی سٹرک پر اپنی جیب دوڑاتا

رہتا ہوں، لیکن ان مقامات پر، جہاں سے مجھے ”انٹیریز“ میں جانا ہوتا ہے۔

میری جیب کے پیسے جیسے خود بخود جام ہو جاتے ہیں اور گاڑی ایک پانچ آگے نہیں

ادکے۔“ اس نے ہاتھ ہلایا۔ اور اس کی جیب ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

وہ سارے درخت جیسے کے دیسے ہیں، گھٹنے گھٹنے، گمبھیر گمبھیر، چپ چاپ، بادل کی حصار اب پتھروں سے بچی کر دی گئی ہے۔ میں مسافر خانے کے احاطے میں داخل ہو گیا ہوں جس کو نہ اب دیوار چھوڑ سکے ہوں نہ ترشی ہوئی بارش۔ مسافر بنگلے کی پچھلی جانب وہ گیٹ جوں کا توں کھلا ہوا جس سے ہو کر مجھے ریل کی پٹریوں تک جانا ہو گا۔ پھر ان پٹریوں کو عبور کر کے میں پلیٹ فارم پر پہنچ جاؤں گا۔ پھر اسٹیشن کے احاطے سے نکل کر میدان میں آ جاؤں گا۔ پھر اس کے بعد سیدھی سڑک، اور یہ سڑک مجھے اپنے بچپن تک لے جائے گی۔

میرے اپنی فریاد کا رٹے جتن سے اس درخت کے نیچے ٹھہر دی ہے، جس درخت کے نیچے میں گھنٹوں بیٹھا جلتے کیا کیا سوچا کرتا تھا۔

میں نے مسافر بنگلے کے خادم کو اشارہ کیا۔ اور اس کے بنگلے کے درجے اور دروازے اس طرح میرے لیے کھول دیے جیسے یادوں کی گھڑیاں کھول کھول کر دکھ رہا ہو۔

”صرف ایک ہی کرسی اور وہ بھی اس طرح ٹوٹی ہوئی!“

”نیا فرنیچر کچھ ہی دن میں، پلائی ہوئے والا ہے صاب!“

”اور یہ پلیس کیوں غائب ہیں؟ ٹنگ تو اسکل نیئی اور مکمل معلوم ہوتی ہے۔“

”کنکشن بھی آگیا ہے صاب، یلب بھی بس آج کل ہی میں پلائی ہوئے دے رہی ہیں۔“

لیکن سفید سفید ایسی ایسی گدا گدا مسمیتوں کی خواب ناک فضا میں سارا بنگلہ اس

طرح سانس لینے لگا جس طرح سیرے اطراف سجی ہوئی یادوں کی ایک چھوٹی سی دنیا میں میرا اپنا وجود سانس لے رہا تھا۔

مجھے مسافر بننے کی دہ۔ اتیں یاد آئیں جب خانوس میں جلتی ہوئی کسی موم بتی کو میرے زوم ہاتھ آہستہ سے بڑھ کر خانوس سے جدا کر دیتے تھے۔ اور پھر موم بتی کے گرم آنسوؤں کی حدت میں کبھی اپنی انگلیوں پر، کبھی اپنی ہتھیلی پر، کبھی اپنے ہاتھ کی پشت پر محسوس کرتا تھا۔ مجھے موم بتی کے ان اشکوں کو جمع کرنے کا عجیب شوق تھا، جو سرد ہو کر سوتی بن جاتے تھے۔ اپنے یہاں ہاتھ کی اداس سے کلپنتے ہوئے شعلے کو پھیلنے، بائیں ہاتھ میں موم بتی کے گداز جسم کو تھامے میں جب میر کی سطح پر، پچھلی رات بہائے ہوئے اس کے اپنے اشکوں کے نشانات تلاش کرتا تو وہ مسک مسک کر آنسو بہاتی۔ یہاں تک کہ اس کا وجود اشک بن کر بہہ جاتا۔ اور پھر یہ آنسو بوتلیوں کی طرح جن لیے جاتے۔ اور میری خوبصورت سی ڈبیا میں محفوظ ہو جاتے، جنھیں میں شامی کو تحفے کے طور پر دیتا اور وہ ان بوتلیوں سے جلتی۔ اس وقت شامی میرے ساتھ ہے، ہمارے تینوں بچے بھی ساتھ ہیں۔

شامی مجھ سے کہتی ہے۔
 ”آپ یہاں آکر کچھ کھوسے گئے ہیں“

شامی سچ ہی تو کہتی ہے، میں اسے نہیں جھٹلاتا ہوں۔

”تم لوگ ذرا استراحت کرو، میں سبتی میں گھوم آؤں“

”تہنا کیوں جائیے گا۔ چلے موڑ ہی پر چلتے ہیں“

”تم سبھی لو۔ اس موسم میں تہل قدمی کا لطف اور یہ ہے“

دہ برساتی میری طرف بڑھادیسی ہے۔ اور بچوں کے ساتھ مسافر بننے کے بارگاہ میں چلی جاتی ہے۔

چھوٹو مجھے ٹوکتا ہے۔ ساتھ چلنے کے لیے ضد کرتا ہے۔ شامی اسے پکارتی ہے، اور میں چپکے سے نکل جاتا ہوں۔ سافر خانے کا پھلنگیٹ پارک کرنے کے بعد میں ہلٹ کر دیکھتا ہوں۔ شامی چھوٹو کو شنگ کھاتی ہوئی مال گاڑی دکھلا کر بہلا رہی ہے۔

میں ریلوے لائن پارک کے پلیٹ فارم پر پہنچ گیا ہوں۔ یہاں مجھے میرا اپنا بچپن مل گیا ہے جیسے وہ برس برس سے میرا منتظر تھا۔ میں بڑھ کر اس کو تھام لیتا ہوں۔ لیکن وہ ضد کرتا ہے۔ میں اسے گود میں اٹھا لیتا ہوں۔ وہ پھر بھی ضد کئے جاتا ہے۔ میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ وہ آخر کیا چاہتا ہے۔ وہ میری آنکھیں میچ دیتا ہے۔ میں اس کی ضد کا سبب سمجھ لیتا ہوں اور آنکھیں بند کیے اسی کی آنکھوں کے سہارے آگے بڑھنے لگتا ہوں۔ وہ مجھے راستہ دکھا رہا جاتا ہے۔

سیدھی جانب یہ جو ہاسٹل کی عمارت جو یہ بالکل حال ہی میں تیار ہوئی ہے۔ میرا بچپن جس کی آنکھوں سے میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ خود اس عمارت کو نہیں پہچا وہ مجھ سے سرگوشی کے انداز میں کہتا ہے۔ میں پلیٹ فارم پر تھا اور اس وقت سیدھے نظر ہوں جب کم عمری میں تم مجھے یہاں چھوڑ گئے تھے۔ میں نے پھر کبھی بستی کا رخ نہیں کیا ہے۔ لیکن پھر بھی میں تم سے زیادہ ان راستوں سے مانوس ہوں۔

یہ ایک وہ موٹر آگیا ہے جس موٹر پر کھوت رہتے تھے۔ چڑیاں سہتی تھیں۔ ریل کے سے چکر کاٹ کر گزرنے کی بجائے فنا صلہ کم کرنے کے لیے ہم اسی موٹر سے ہو کر گزرتے تھے۔ ریل گاڑیوں کا سلسلہ ختم ہوتے ہی، دراصل یہ ایک چھوٹا سا دیوان میدان ہے جس کو نیم اور پیل کے گھنے قد آور درختوں نے اپنے سالیوں میں چھپا رکھا

ہے بستی سے نشیب میں ہونے کے باعث اطراف کا بہتا ہوا برساتی پانی یہاں
 آکر خانہ بدوشوں کے قافلوں کی طرح بکھڑ جاتا ہے۔ لیکن شاید یہ قافلے اپنا سفر
 جاری رکھنے کی سکت کھو بیٹھتے ہیں جو مستقل طور پر بھوت پریت کے ماحقوں مقید
 ہو کر یہاں کے ہو رہتے ہیں۔ گاؤں کے اکثر سو رکناروں کی کچھڑ میں طبقاتی نظام
 کے خلاف کانفرنس کرتے ہیں۔ چھوٹ چھات کے مسئلہ پر گرگرم بحث کرتے ہیں۔ اور
 پھر کچھ ہی میں سو رہتے ہیں۔ اس آسیب زدہ میدان کی دیواروں میں مخلوق ہی ہو
 اس میدان کی ساری زمین سیلی ہوئی ہے۔ غم ہے۔ میں، شامی اور دوسرے بچے
 اس میدان میں سے بک ٹپ بھاگ کر شکر کے ایک کنارے سے دوسرے
 کنارے تک پہنچتے ہیں۔ اور بہادری سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔
 چہرے سب کے قتمائے ہوئے ہیں۔ شامی تو بس لال لال ہو کر رہ گئی ہے۔ کوئی
 کہتا ہے جب میں میدان کے بچوں بیچ پہنچا تھا تو میرے انگ پر کانے آگے
 تھے۔ دوسرا کہتا ہے کہ میں نے تیسرے درخت کی سب سے نیچلی شاخ کے پاس
 سسکیوں کی آواز سنی ہے۔ کوئی اضافہ کرتا۔ وہ دیکھو۔ یہ۔ وہ۔ وہ۔
 وہ غائب ہو گیا۔ شامی میرے پیچھے چھپ جاتی۔ پھر ہم گاؤں کی فضیل کی طرف
 بڑھ جاتے۔

میرا بچپن مجھے اس آسیب زدہ میدان میں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا ہے۔ اور
 شکر کے کنارے میرا منظر ہے۔ میں ایک درخت کو تک رہم ہوں۔ اس کے
 گھنے سائے کو تک رہم ہوں۔ زمیں کی وہاں سلیں اور آج بھاجوں کی توں ہے۔
 ٹھہرے ہوئے پانی کے کناروں کی کچھ پر آج بھی خنزیر جمع ہیں۔ لیکن وہ آسیب

کہاں چلے گئے۔ وہ چڑھیں کہاں چلی گئیں۔ جو میرے بچپن نے اپنی دلچسپی کے لیے اس میدان میں بسا رکھے تھے۔ بس ایک دیرانی سی لڑائی اس مقام پر سلاطین۔
 تفصیل کے قریب سڑک کی دونوں جانب کچھ دوکانوں کا اضافہ ہو گیا ہے
 ایک ٹیکسی سائیکل کی دوکان، ایک آٹے کی گڑنی، ایک موچی کی دوکان جو صرف
 چیل بناتا ہے۔

بہن تفصیل کے دروازے پر کھڑا ہوں۔ یادوں کی ایک دنیا اپنے سینے میں
 بسائے ہوئے۔ تفصیل کے دروازے میں دونوں جانب سائیکلوں کے نیچے آج
 بھی وہ تخت جوں کے توں پڑے ہیں۔ جن پر فزیت نواز بیٹھتے تھے۔ ایک تخت
 پر ایک بڑا سا علم بٹھایا گیا ہے۔ جس کے سامنے آٹھ ٹیبلٹوں میں عود چل رہا ہے۔
 اس کے مقابلے کے سائبان میں آدھے تخت پر پان سگریٹ کی ایک چھوٹی سی کال
 لگائی گئی ہے۔ آدھا تخت پر دس کے نیچے چھپا ہوا ہے، جہاں سے دھواں اٹھ
 رہا ہے۔ اور کوئی کھانسی کھانسی کر چوٹھا پھونک رہا ہے۔

میرے کانوں میں نفیریاں اور فزیت زنج رہی ہے، میں سر جھکائے تفصیل کے
 دروازے میں داخل ہو گیا ہوں۔ سر اٹھاتا ہوں تو سامنے بستی کی شاندار چادر
 پر نظر پڑتی ہے جس میں آج بھی پولیس چوکیاں قائم ہیں لیکن وہ مظنہ کہاں!

میں بڑھتا رہتا ہوں کہ کوئی میرے قدم تھام لیتا ہے۔ میں بائیں جانب
 مڑ جاتا ہوں۔ یادوں کی اس دنیا میں جو میرے ذہن میں بسی ہوئی ہے ایک
 ہنگامہ سا ہو جاتا ہے۔ میرا بچپن ایک ایک تصویر میرے اہم میں سے لے دردی
 سے کھینچ کر نکال رہا ہے اور میرے اطراف تصویریں ہی تصویریں کھڑکی ہیں۔

شبو نے کرکٹ کا ملا پوری طاقت سے گھمایا۔ بس فٹ وکٹ کے پیچھے اس کی گیند پڑی ہے اور اس کو اسٹمپ کرنے کی کوشش میں بے ہوش ہو گیا ہوں۔ سارے ساتھی میدان سے فرار ہو گئے ہیں۔ لیکن ایک بھگ دوڑی گئی ہے۔ چیرا سی صیغہ دار سب ہی دوڑ پڑے ہیں۔ ابابھی اپنے اعلا س کے ٹھاٹھ باٹ اور رعب داب بھول بیٹھے ہیں۔ ان کی متین اور سنجیدہ حال جس کے متبی بھر میں چرچے تھے۔ ان کا پر تکنت اندازہ خرام جس کی لوگ باتیں کرتے تھے سب دھرا کا دھرا رہ گیا ہے۔ اور وہ بے تحاشا بھرتک پہنچنے کے لیے بانڈازہ دگرتے ہیں۔ جب مجھے ہوش آیا تو ہنوں نے بتلایا کہ شامی کے آنو ایک لمبے کیلے خشک نہیں ہوئے۔ شامی آئی تو مجھے سکرا سکرا کر دیکھا۔ کہنے لگی۔ ”میں بہت روٹی کھا رہی تھی۔“

”تو کون سی بہادری کی بات ہوئی؟“ میں نے اپنی خوشی کو بھرا کر کہا جو جانے کیوں مجھے شامی کے رونے کی بات سن کر ہوئی تھی۔

”تو کون تھیں بہادری بتاتا ہو جی؟“ وہ جھگڑنے لگی۔

میں نے اس کو پھر چھیڑا۔ ”پھر اتنے بہت سارے آنو کیا گو دیے تم نے؟“

”آٹھ دے دونا۔“

”کیا کر گئے کر؟“

”اسی ذبیہ میں رکھ لوں گا جس میں موم کے آنو کھا رہے لیے جمع کرتا ہوں؟“

”میرے موم کے آنو کی طرح ہاتھ نہیں لگنے کے؟“ وہ سنہی اور بھاگ گئی۔

کیسی کیسی یادیں۔۔۔ بھاری بھاری سے سراٹھا کر بچھ بھیلانے چھوٹنے والی ناگنوں کی طرح صرنا جوم نہیں رہی تھیں؟ اس بچی رہی تھیں۔

میں سبکی کی سب سے اونچی عمارت کے سامنے کھڑا ہوں۔ یہ ابابکا دفتر تھا۔ اب یہاں ضلع پریٹ ہائی اسکول ہے۔ تعطیل کے روز جب کہ دفتر بند ہوتا تھا، ہم بچے جمی بھر کے ادھم مچاتے تھے۔ گھنٹے گھنٹے نیم کے بیڑوں کے نیچے بکھری ہوئی بیچی بچی بنویاں جن کی حافی تھیں۔ پھر دوکانیں سمجھتی تھیں۔ لیکن اس دوکان داری میں میرا حصہ بس اتنا ہوتا کہ نیم کی شاخیں ہلا کر بچی بنویاں اپنے پھوٹوں کے نیچے بٹھا ڈیتا۔ یعنی میں عمر کی اس منزل میں تھا جہاں ہاتھ بڑھا کر کسی مغرور شاخ کو جھکا دینے میں آدمی بڑائی کرتا ہے۔

ضلع پریٹ کے اس ہائی اسکول میں جہاں اب بے شمار فحشی فلمیں زندگیوں کو ملیں کو ملی ہیں، ناپختہ شعور اور پختہ ارادوں واسطے نوعمر اپنے مستقبل کے بنانے اور سنوارنے میں کوشاں ہیں وہیں میرا ماضی بھی گوشے گوشے میں چھپا بیٹھتا ہے۔ میں نے زندگی کے اپنے اس سفر میں کیا کیا کھویا ہے۔ اور کیا کیا پایا ہے، اس سے میرے اس کھلنے پھولنے بچپن کو کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ تو مجھ سے اسی بانجھوں کے ساتھ ملتا ہے۔ لیکن میں جانے کیوں ایک کھنگنی ہوئی مہنی بھی اس کی نذر نہیں کر سکتا ہوں۔ اور آگے بڑھتا ہوں یہ ہمارا مکان ہے۔ میں مکان کے صدر دروازے تک آ رہا ہوں صدر دروازہ جیسے صرف میرے لیے کھلا رکھا گیا ہے۔ میرا اشتیاق کس قدر بڑھا گیا ہے۔ گھر میں اپنے ہی گھر میں اس طرح داخل ہو رہا ہوں۔ جیسے کسی دوسرے کے گھر اپنی کوئی سب سے زیادہ قیمتی شے تلامش کر رہا ہوں جو گم ہو گئی ہے۔ دروازہ دروازے سے تک رہے ہیں یا میں کہیں حسرت سے تک رہا ہوں فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ حسرتیں مشترک ہیں۔ میں احتیاط سے قدم بڑھاتا ہوں، یادوں کے اس جھرمٹ میں کسی کو نظروں سے گدگداتا ہوں۔ کسی سے

نظر میں چراتا ہوں اور آگے بڑھتا بڑھتا آہستہ آہستہ اس دروازے تک آ پہنچا ہوں جہاں سے مجھے اپنے گھر کے اندر دنی جھسے میں داخل ہونا ہے۔ لیکن دروازے پر قفل لگا ہے۔ میں تڑپ کر رہ گیا ہوں، جیسے کوئی دودھ پیتے بچے کو اس کی ماں کے سینے سے جھپٹ لے۔ کاش یہ دروازے ایک بار میرے لیے کھل سکتے۔ یہ باہیں ایک بار میرے لیے وا ہو سکتیں۔ پتہ نہیں میں پھر کبھی ادھر آ بھی سکوں گا یا نہیں میں اپنی آنکھیں دروازوں سے لگا دیتا ہوں، لیکن کوئی درزن در نہیں چھوٹے اندر کی خاموشیوں میں بسی ہوئی دنیا کا فظا رہ کر اس کے جس کو اب اس سیتی بھر میں صر ت میری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں کتنی آدائیں میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ میرا بچپن تراشہ رہے، بڑا ظالم۔ اس نے ابھم سے نکال کر ساری کی ساری تصویریں میرے ادیر ہوا میں اچھال دی ہیں اور میں دیوانوں کی طرح ایک ایک تصویر پر چھپٹ رہا ہوں جو میرے اطراف زمین پر بٹھیر ہو رہی ہیں۔ لیکن میں جھک کر دیکھتا ہوں تو زمین پر کوئی تصویر نہیں ہے۔ عمر رفتہ کا کوئی نقش پائیں ہے۔

مقتل دروازے پر، چلڈرن دلیفر سنٹر کی تختی لگی ہے۔ میں اسی آنے والی نسل کو اپنا ابھم سوچ کر لوٹ رہا ہوں جس کی تصویریں فونج لی گئی ہیں۔ باہر نکلتا ہوں تو بارش شروع ہو چکی ہے۔ لیکن ایک نوجوان بند کھڑکی کے سائبان کے نیچے کھڑا اپنا چہرہ کھڑکی کے پٹ پر جمائے درزن میں سے جھانک رہا۔ میں اپنی برساتی کتیں بھول آیا ہوں۔ ادھر ادھر دیکھتا ہوں برساتی صدر کے شے نشین پر دھری ہوئی مل جاتی ہے۔ میں سے ادھر کر باہر نکل آیا ہوں۔ نوجوان ہے خیر ہے۔ جب میں اس کے قریب نظر میں جھکائے گزرتا

ہیں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ کھر کی کے اندر دنی پٹوں پر بھی کسی کے جلتے ہوئے ہیں
 بال رکھے ہوئے ہیں۔ چپتے ہوئے ہونٹ رکھے ہوئے ہیں۔ میرے دہلے دہلے
 دیووں کی چاب سُن کر نوجوان میری طرف دیکھتا ہے میں بھی باوجود اس کوشش کے کہ
 اس کو اس بات کا احساس نہ ہو کہ میں اس راز دنیا کو تار گیا ہوں ماس کے
 ہونٹ دیکھے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس کی ناک اور گالوں پر کھڑکی کا ہر رنگ نمایاں
 نور پر لگ گیا ہے۔ یہ ان بوسوں کی حسرتیں ہیں، جو نہیں لئے جاسکے۔ نوجوان
 اس بات سے بے خبر ہے کہ اس کی یہ حسرتیں اس کے چہرے پر ابھر آئی ہیں۔
 جیسے اس راہ گیر نے دیکھ لیا ہے جس سے اس کی آنکھیں ابھی ابھی چار ہونی تھیں۔
 در واقعی میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔

شامی میری منتظر ہوگی۔ چھوٹو میرے لیے ضد کر رہا ہوگا۔ حذر اور بٹیا اسے
 ہلا رہے ہوں گے۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا، مسافر جنگے کی طرت لوٹ رہا ہوں۔
 میں نے اپنے بچپن کو جو ٹیشن سے سنی تک میرے ساتھ آیا تھا، یہیں چھوڑ دیا ہے۔
 میں پھر ادا اس ہو گیا ہوں۔ جی چاہتا ہے سارے آنسو شامی کے دامن کی کھینٹ
 بڑھا کر خاموش موجاؤں۔ پھر خیال آتا ہے کہ خود اس کے پاس ان آنسوؤں کی کمی
 نہیں۔ میرے پاس رہ ہی کیا گیا ہے جو شامی کو دے سکوں۔ سو مہینے کے آنسو
 کھیلنے والی یہ لڑکی اپنے دامن میں آنسوؤں کی کتنی ہی دولت سمیٹے ہوئے ہے
 دھوئی تو نہیں بنی ہے اس کی آنکھوں میں کنکریں کرکھٹکتے ضرور ہیں۔

اس غم کی اساتذہ کیا ہے۔ کچھ بھی ہو۔ لیکن پھر کسی کی یاد میرے ذہن میں مرسا
 دل میں میری روح میں اپنا نہ ہر قطرہ قطرہ کر کے ٹپکار رہا ہے ابنا نہ ہر جواب

میری نس نس میں سرایت کر کے مجھے پیارا ہو گیا ہے۔ ہر وہ غم جو زندگی کے کسی رخ سے بھی مجھ تک پہنچتا ہے۔ ہر پھر کہ اسی ایک یاد سے وابستہ ہو جاتا ہے جسے میں نے بڑے جتن سے اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔ یہ بھی ایک بارہ سالہ کھلڈرے شہر لڑکے کی یاد ہے۔ یہ وہ لڑکا نہیں ہے جو آئین سے بستی تک میرے ساتھ تھا۔ اور جس کو میں ابھی ابھی بستی میں تنہا چھوڑ کر آیا ہوں۔ یہ لڑکا تو اس لڑکے کی زندگی بھر کی تنہائی ہے۔ یہ لڑکا تو اس لڑکے کی تکمیل کا نام ہے، جو نہ ہو سکی نہ ہو سکے گی۔۔۔ یہ لڑکا سیرا بچہ ہے۔ سیرا بیٹا۔ میری جان۔

اس لڑکے نے اپنا بارہ سالہ خوبصورت ماضی مجھے سونپ دیا ہے۔ اور اس ڈھنگ سے سونپا ہے کہ یہی بارہ سالہ ماضی اس کا حال بھی ہے، اس کا مستقبل بھی اس نے سوا اس کا نہ کوئی حال ہے، نہ کوئی مستقبل۔

مجھے یاد ہے، ایک بار اس نے اپنے پڑوس کی، ساتھ کھلی ہوئی لڑکی سے کہا تھا۔
”ممنی، میں تجھے اپنی بہن نہیں بناؤں گا۔“

اس بہن نہ بنانے میں کیا کچھ نہ بنا لینے کا جذبہ تھا۔۔۔ میں بھانپ گیا تھا اس تاڑ گیا تھا۔ طوفان کی آمد آمد کو میں نے پہچان لیا تھا نا۔۔۔ میں نے اس سے پوچھا تھا۔

کیا بنائے گا پھر؟

اس نے مجھے جھکی جھکی شرمیلی نظروں سے دیکھا تھا۔ میں نے اتنی خوبصورت جھکی جھکی نظریں آج تک نہیں دیکھی ہیں۔ یہاں تک کہ میں نے خود اس کی بھی ایسی جھکی جھکی نظر پھر کبھی نہیں دیکھی۔

وہ ایک دن کھیلتا کھیلتا نجد سے، شامی سے، اپنی چھوٹی بہن اور چھوٹے بھائی کو
 جدا ہو گیا۔ اس طرح جدا ہو گیا جیسے کوئی آنکھ مچولی کھیلنے کے لیے لمحے بھر کے لیے
 انا چاہتا ہو، پھر سامنے آنے کے لیے۔ لیکن وہ لمحہ ہی ٹھہر گیا جس لمحے وہ چھپا تھا۔
 لوگ کہتے ہیں وقت ہر زخم کو مند مل کر دیتا ہے۔ میں سوچتا ہوں، کاش ایسا
 نہ ہوتا، شاید وقت اس زخم کو مند مل نہیں کر سکتا، جو وقت کے ٹھہر جانے سے انا
 دل پر لگتا ہے۔

میرا بچپن جسے میں ابھی ابھی بستی میں چھوڑ آیا ہوں، دبے پاؤں میرے پیچھے پیچھے
 ہاں تک چلا آیا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ تھام لیے۔ مجھے غور سے دیکھا۔
 کیا تم وہی ہو جنہوں نے مجھے ابھی ابھی بستی میں تنہا چھوڑ دیا؟

کیا تم میری تلاش میں یہاں تک نہیں آئے تھے؟

میں نے منہ پھیر لیا، تو اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیے۔ ٹھیک ہے، آج سے میں بھی اسی کو
 غور سے دیکھتا ہوں، لیکن کیا اس تلاش میں ہم کبھی ایک دوسرے کو پہچان سکیں گے؟
 میں لپٹ کر دیکھے بغیر آگے نکل آیا ہوں۔

چھوٹو ضد کر رہا ہوگا۔

ندو۔ بیٹیا۔

ابھیں خوب چوسوں گا۔ لیکن عین اس وقت کوئی اپنا گال بھی تیرے ہونٹوں پر رکھ دے تو؟
 میری اور شامی کی محبت کا پہلا حق دار تو آج بھی وہی ہے نا۔

میرے بہرے پر ان بوسوں کی حسرتوں کا کون سا رنگ ابھرے گا؟

بہادر

مصنوعی سلک کی سفید قمیض، بھر داں چوڑی کی نئی تہہ شعلہ کا طرہ نمایاں۔
 نمایاں، جبرٹوں میں پان کا بیڑہ دبائے علی بہادر ضلع کی سستی سے گزرتا تو ہنس ہنس کر
 سلام کرتا بھی سلام لیتا بھی۔ پولیس ایکشن کے بعد اس نے حیدر آباد کی کورٹس بجانا
 چھوڑ دیا تھا۔ بڑے ادب سے منستے کرتا وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر۔ علی بہادر کو سلام کا یہ
 نیا طریقہ اس لیے اس آیا کہ اس کی دستی گھڑی کی تائش آسانی سے ہونے لگی علی بہا
 ر ستینیں اٹھائے رکھے بھی تو سارا زمانہ کام دھندہ چھوڑ کر گھڑی کو تکیے سے رہا۔
 ’نستے‘ میں یہ مشکل آسان ہو گئی تھی۔

جب سے ضلع کا نیا عہدے دار آیا تھا، علی بہادر پر سلاموں کی بارش ہونے
 لگی تھی پیشی کا چہرہ اسی اور وہ بھی منہ چڑھا۔ دفتے میں علی بہادر کی چلتی، گھر میں علی بہا
 ر کی۔ اور اب تو سستی بھر میں علی بہادر کی چلتے لگی تھی۔ عہدہ دار تو دیکھتا بھی آسمان

کی طرف تھا چلتا بھی آسمان ہی پر تھا۔ وہاں تو فرش بھی دیہی تھا عرش بھی دیہی۔ مگر علی بہادر تو اسی زمین کے بسے دانے تھے۔ چھوٹوں سے سیں جوں بڑوں سے سیں ملاپ۔ جتنے آداب سلام، آسمان پر نظر رکھنے کی وجہ سے عہدہ دار تک نہ پہنچتے اور زمین ہی پر ادھر ادھر دھیر ہو جاتے، وہ سب کے سب علی بہادر سمیٹ لیتے۔

علی بہادر پہلے بھی چپراسی تھے۔ آج بھی چپراسی ہیں۔ لیکن آج جو اہمیت انھیں حاصل ہو گئی تھی وہ نئے عہدے دار ہی کی جوتیوں کا طفیل تھا۔ اسی احساس نے علی بہادر کو اس قدر وفادار بنادیا کہ وہ جلو توں سے اٹھ کر عہدے دار کی خلوتوں تک چلا پہنچے اب تو وہ منہ چڑھے پیشی کے اردلی ہی نہ تھے، ہم راز بھی تھے۔ ہم سفر بھی۔

نظام باڈے سے بی جانی کو ساتھ لے کر کچی سڑک تک پہنچتے پہنچتے علی بہادر نے کہنے ہی سلام لے، کہتے ہی نظر انداز کر دیے۔ وہ گزر گئے تو سلام کرنے والوں اشاروں کنایوں میں باتیں کیں۔ کچھ اور آگے بڑھ گئے تو سرگوشیوں تک ذہن پہنچی۔ بی جانی لاکھ بوتلے میں ہوں۔ بدن کے پیکٹے ہوتے شعلے اپنی ٹوکیلی زبانیں برقعے کے باہر بھی تو نکال نکال کر راہ چلتوں کو ڈستے ہیں۔

بی جانی کو کچھ ایسے زیادہ دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس کے بچپن کے خاموش سے ٹھہرے ہوئے پانی کی سطح پر اس کی جوانی نے ایک پتھر دے مارا اور شانتی تڑپ تڑپ اٹھی۔ چھوڑے، اٹھو پیسے اور مالیدے کی قاب کیچے رنگ میں رنگے ہوئے لاکھ پٹے سے ڈھانک کر بی جانی کی نانی صرف دو ایک گھر دن ہی میں دے آئی جس سے تعلقات بہت گہرے تھے ان میں سے ایک گھر تو ایسا بھی تھا جہاں بی جانی کی بات بچی ہو چکی تھی۔ نانی نے سوچا اب ایسوں سے بھی کیا چھپانا جو بھولی پھیلائے ٹھیکر سی

مذبح کے پیچے بیٹھے ہیں کہ بھل چکے ہیں ہی بٹسے اسی بھولی میں گسے گا۔ ہاں پر اسے
البتہ پر اسے تھے اور پھر اسی میں مصلحت بھی تھی کہ بی جانی آسانی سے گھوم پھر سکتی۔

نانی راز کے پردے بی جانی کی جوانی پر ڈال کر مطمئن ہو بیٹھی کہ جہاں وہ چاہے
گئی پس وہیں یہ راز افشا ہو گا۔ لیکن علی بہادر برقعے میں ڈھکی ہوئی بی جانی کو لے کر
چکی بزرگ تک ہی پہنچے تھے کہ لونڈوں نے ایک دوسرے کے کہنیاں ماریں۔
ٹھوکے دیے۔

”نمبر پر آگئی ہے خان“

”اب تو برقعے بغیر نکلتی ہی نہیں“

”کیا پٹا تھ تھی یار“

لیکن علی بہادر کس گھر کے کس پتھر پر اس پٹانے کو دے ماریں گے ابھی اس
کا علم کسی کو نہ تھا۔

پولیس ایشن نے خاص طور پر اس ضلع کے مسلمانوں کی اکثریت کو آزادی کے
نام پر اتنا ادب اٹھایا تھا کہ وہ اس زمین سے اٹھ کر سیدھے آسمانوں تک جا پہنچے
تھے۔ کتنی مائیں اپنے گردیل نوجوان بیٹوں کو گھوچکی بھتیں۔ کتنی بہنیں اپنے بھائیوں
کو کستوں کا سہاگ اجڑ چکا تھا۔ کستوں کی محبت لٹ چکی تھی۔ اور ضلع کے کون سے
گلی کو چوں میں اب یہ آہیں۔ بازار میں بکنے والا جسم بن کر رہ گئی ہیں۔ اس سے
کھی بہادر واقف تھے۔

ایسا ماحول جو ضلع کی بستی کے ہر کس دنا کس کی دسترس میں ہوتا، اس کی

حکم حاکم کو انھوں نے یہ درجہ دے رکھا تھا وہ تو کوئی صاحبِ ایمان جاننے لیکن کہتے وہ ضرور کچھ اسی طرح تھے۔

”نہیں بھئی سو یا رکھا چکی ہے جس کسی نے سچری کی وہ ہمارے ایمان سے خارج ہوئی۔“

انھیں کرکٹ کی سچری دالی بات بہت بھاگتی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس میں ”سو یا رکھا چکنے“ کا عامیانہ پن نہ تھا معنویت بھی تھی، اختصار بھی، نفاست بھی۔ اب وہ بہت آسانی سے کہہ دیتے۔

”نہیں بھئی سچری کر چکی ہے۔“

علی بہادر نے ایک دن اپنے صاحب سے کہا بھی۔ انھیں ڈرتے مرتے سمجھایا بھی کہ سرکارِ جتنی اب تک آپ چکی ہیں انھیں میں سے جو زیادہ پند ہوں انھیں پھر لے آؤں۔

حاکم نے صرٹ اتنا ہی کہا ”علی بہادر کیا ہم اپنی دھرم پتی کو اسی لیے شہر میں چھوڑ آئے ہیں کہ یہاں آکر کسی ایک عورت کے ہو رہیں۔ اگر یہی کرتا ہوتا تو ہماری دھرم پتی بھی اتنی گمراہ نہ ہوتی۔“

علی بہادر پر جیسے گھر دں پانی پڑ گیا۔ وہ بھینکا ہوا مرغ بنا حاکم کے سامنے کھڑا ہوا۔

”اچھا حضور“ اور انھوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر بڑے ادب سے منے کیا۔

وہ جانے لگے تو حاکم نے پوچھا ”سمجھ گئے نا۔“

”ہاں صاحب۔“

علی بہادر باہر نکلے تو انھوں نے سوچا، اس تعداد میں تو بالکل نیا مال نہیں ملنے کا۔ صاحب کے منہ کو خون لگ گیا ہے۔ اس لگے ہوئے خون کو دھو ڈالنے کی ترکیبیں وہ سوچنے لگے۔

علی بہادر تو یہ چاہتے تھے کہ اتنی بہت سوں میں سے ”صاحب“ کسی ایک کا ہو کر رہے۔ ایک کا نہیں دو کا۔ دو کا نہیں چار کا، پانچ کا اس سے ان کا کام بھی ہلکا ہوتا تھا، ذمہ داریاں بھی کم ہوتی تھیں۔ صاحب کی زندگی بھی ایک ڈگر پر چل پڑتی اور وہ بھی چین اور اطمینان سے ان نعمتوں سے استفادہ کرتے جو صاحب کی مہربانیوں کی وجہ سے خوش حالی بن بن کر ان کے راستے میں بچھ رہی تھیں۔

ایک روز علی بہادر ایسے مقام پر جانکے جہاں کا آنا جانا انھوں نے عرصہ سے چھوڑ رکھا تھا۔ انھیں مدتوں بعد ادھر کا رخ کرتے ہوئے ان کے جیلوں نے دیکھا تو بس دوڑ ہی تو بڑے۔

علی بہادر نے کہا۔

”لاؤ بھی کوئی سبھی ہی سہی“

علی بہادر کے ماتحت اور چیلے حیران تھے۔ لیکن علی بہادر نے یہی ترکیب سوچ نکالی تھی کہ خود ”صاحب“ کہہ اٹھے گا کہ نئی چیزیں اس قابل نہیں ہیں تو وہی بہتر ہیں جن کی آزمائش ہو چکی ہے۔

لیکن صبح علی بہادر کی حیرت کی انتہا نہیں تھی جب کہ صاحب خوش تھا اور کئی راتیں اس نے ”سبھی“ کے ساتھ گزار دیں۔

علی بہادر کے حوصلے بڑھ گئے۔ صاحب کو ادھر کھلی کلیاں پتہ نہیں ہیں اس کو تو شگفتہ پھول چاہئیں۔

کچھ دن بعد صاحب نے اس قسم کے کسی دو سے شگفتہ پھول کی پھر فرمائش کی۔ اب کی بار علی بہادر نے جب نئی عورت حاکم کے حوالے کی تو وہ رات بھر خود بھی نہ سو سکا۔

صبح ہوئی تو ”صاحب“ نے کہا۔

”بہادر تم واقعی بہادر ہو۔ کیا بچھری ہوئی شیرنی جنگل سے کپڑا لے کر پھرتا ہے؟ یہی میں نہ آتی تھی۔ آنسوؤں کا تو خزانہ ہے اس کی آنکھوں میں۔ کہتی تھی تم اسے دھوکا دے کر لاسے ہو۔ بڑی شکل سے قابو میں آئی وہ“

علی بہادر بس ہلکے ہانڈے سے کھڑے مسکراتے رہے۔ یہ مسکراہٹ فی الوقت تو فاختانہ بالکل نہ تھی، بڑی بدخودارانہ تھی۔

جب حاکم نے کہا کہ۔

علی بہادر! آج رات انہیں پھر لے آنا۔ ۱۱

تو علی بہادر بھگڑی کا طرہ بڑے بانجھن کے ساتھ درست کرتے ہوئے بہت ہی فاختانہ انداز سے بد قد پوش عورت کو ساتھ لیکر باہر نکلنے لگے۔ پھر آہستہ سے قریب ہو کر کہا۔

”اب اس کو ہمیں رکھ بیجئے۔ بڑی ضدی اور پانی کی عورت ہے۔ پتہ

نہیں میری بات اب کبھی ملنے لگی یہ۔ میں بھی نہیں رہوں گا تو آہستہ آہستہ مانوس ہو ہی جائے گی۔“

حاکم نے بڑی رازداری سے پوچھا۔

”پھر اس کے گھر والے؟“

علی بہادر نے صاحب کے اور زیادہ قریب ہوتے ہوئے کہا۔

”آپ اس بات کی فکر نہ کریں۔ اس نے بتایا نہیں آپ کو؟۔ یہ میری

بیوی کا ہے۔“

”صاحب“ نے علی بہادر کی بیٹھ کھونک کر کہا۔

”تم بڑے بہادر ہو، بڑے وفادار۔“

علی بہادر کچڑھی کا طرہ بڑے بانچن کے ساتھ درست کرتے ہوئے باہر

نکل گئے تو حاکم کے منتظر کتنے ہی لوگوں نے انھیں جھک کر سلام کیا۔

ایک سوال

کپڑے بدل کر کسی کام سے باہر جانے کے لیے نکلا تو کالونی کی نگر پر مجھے زینو
 ن گئی دو وقت۔ رے بیوں تو پتہ نہیں کیوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرا کچھ
 کھو گیا ہے جس کی میں تلاش کر رہا ہوں۔ لیکن یہ احساس چونکہ غیر شعوری طور پر میرے
 ذہن و دل میں رچ بس گیا ہے۔ اس لیے میں ان وقتی اداسیوں سے کچھ مانوس رہا ہر چلا ہوں
 جن کی شاید کوئی اساس نہیں ہے اور جو دھیرے دھیرے میرا مزاج بگاڑ گئی ہیں۔ اس
 عالم میں زینو مجھے کالونی کی نگر بدل گئی۔ پہلے تو میں نے اس کے سلام کا جواب سلام سے
 دے دیا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ چاہتا تو اس سے میں یہ پوچھ بھی سکتا تھا کہ اندھیرے اجالے
 کے اس سنگم پر۔۔۔ پیل کے گھٹے سائوں کے نیچے۔ بھری شام کے وقت، جہاں سہی ہوئی تاریکیوں
 کو ٹرک بڑھم روشن، اجنبی کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ وہ اکیلی کیوں کھڑی ہے۔ اسے کس کا
 انتظار ہے۔

زینونہ نئی توہنی دلہن ہے۔ اس کا شوہر کسی درکشاپ میں کام کرتا ہے۔ جو رات گئے لوٹتا ہے۔ اور جو میرا دوست ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کے لیے شام ہمارے زینونہ کے منتظر رہتا ہے۔
 کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ زینونہ کی انتظار کی کھڑیاں تو دن ڈھل سوتی ہیں اور رات گئے بیدار ہوتی ہیں۔ لیکن میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ بس چپ چاپ اس کے پاس سے یوں گزر گیا۔ جیسے شادی کی برات کے برائے جنازے کا کوئی بیلوس گزر جاتا ہے۔
 اس نے خود مجھے پکارا۔ مبین بھائی۔ میں نے یہ آواز پکڑ اس طرح سنی جیسے کوئی پکار نہیں رہا۔ بلکہ پکارنے کی تمنا کر رہا ہے۔

میں اس کے قریب پہنچی تو اس نے کہا۔۔۔ سجادے اب تک نہیں لوٹا۔ اس کا گلہ رندھا ہوا تھا۔ ہمدردی کا ایک لفظ بھی اس کی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے آنسوؤں کا بستہ توڑ دینے کے لیے کافی تھا۔ مجھے ترودھ ضرور ملے گا۔ لیکن میں نے اسی لیے اپنی پریشانی اس سے چھپائی۔ اور جھوٹ موٹ ہی اس کا مذاق اڑاتا ہوا ہنسنے لگا۔
 ”تو بھلا اس میں روتے دھوتے کی کیا بات ہے؟“

”تو پھر کیا کروں؟“

”خوب تم لڑکیوں کا جواب نہیں۔ گویا رونا دھونا بھی کچھ کرنے میں داخل ہے۔“
 وہ مسکراتے لگی۔ اس کے مسکراتے کا سماں بالکل ایسا تھا جیسے پیپل کے گھنے سائے میں شکر کی دھم روشنی کا سماں۔

”بولیے نا۔ کیا کروں میں؟“ اس کے رندھے ہوئے گلے کا نمایاں درد۔ اب سوزِ پنہاں بن رہا تھا۔

”دوسری جنہاں کہاں چلی گئیں؟“ میں نے تفصیلات جاننے کے لیے پوچھا۔

”سب کی سب اڑوس پڑوس میں اسی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔“
 ”اور تم یہاں کھڑی ہوئی آنسو زمین میں بوری ہو کر فصل اگے تو کاٹ سکو۔“
 ”انترستین بھائی — کچھ کیجئے نا۔“

”دھسکول گیا تھا آج؟ — میں نے اس طرح جرح کی جیسے لمحہ بھر میں اسے لاکھڑا کر دوں گا۔“
 ”جی ہاں گیا تھا۔ لیکن اب تک نہیں لوٹا۔“ — وہ پھر رو پڑنے کو لگتی۔

اس کے لیے یہ چھوٹا سا حادثہ یقیناً تشویشناک تھا۔ مجھے اس سے ہمدردی تھی۔ میں نے اس کے دکھ کو پوری شدت سے محسوس بھی کیا تھا۔ سجاد سے اس کا اکلوتا، چھوٹا اور چیتا بھائی تھا۔ وہ عمر کی اس منزل میں تھا۔ جہاں ایک بھول، ایک غلط قدم زندگی بھر کا حاصل ہو کر مستقل کا مقدر بن جاتا ہے۔ سجاد سے ویسے مجھے بھی پیارا تھا۔ میرے اس تعلق خاطر کے دو سبب تھے۔ ایک تو یہی کہ یہ بارہ تیرہ سالہ سا لڑکا، سلونا لڑکا نظر بٹرانیک تھا۔ اس کے سر سے زمانے کی ہوا کے وہ بھونکے ابھی نہیں گزرے تھے۔ جو اس عمر کے لڑکوں کو اسکول سے اٹھا کر گلی کوچوں میں لے آتے ہیں۔ پھر بڑی بڑی سڑکیں اور شاہراہیں اس کی ہمدم دھما راز بن جاتی ہیں۔ اور گھر میں ان کا بھی نہیں لگتا۔ دوسری ایک جذباتی وابستگی جس بنا پر وہ مجھے اچھا لگتا تھا۔ علاوہ ازیں یہ تھی کہ میرے اپنے بچے کا وہ کبھی بڑا گہرا دوست بھی تھا۔ آج میرا بچہ بھی اس دنیا میں ہوتا تو یہ دوستی آج تک قائم رہتی۔ شاید وہ بھی تیرہ کے دکھ درد کا کچھ مدا د کر سکتا اور اپنے دوست کی تلاش میں اپنے ننھے ننھے سے دھڑکتے ہوئے دل کو لیے لیے سرگردان رہتا لیکن اس کا دل تو بس کھیلتے کھیلتے ہی ٹھہر گیا تھا اور وہ مجھ سے، اپنی حمی سے، اپنی بہن اور بھائیوں سے کچھ بھی نہ ملنے کے لیے جدا ہو گیا تھا۔ اور اس کے بعد میں آج تک اسے نہیں پکارا ہوں کہ منیر شاہ ہو گئی ہے گھر لوٹ آؤ۔

آج زینو نے سجادے کے گھر نہ لوٹنے کی بات اس ڈھنگ سے کی کہ میں تڑپاٹھا۔ جی چاہا، اس سے پوچھوں کہ بچگی آنسوؤں کی فصل میں اگی ہے جو اگے گئی۔ سجادے تو صبح کا بھولا ہے جو شام کو گھر لوٹے گا ہی۔ میرا سینہ تو شام کو اس طرح گھر سے چلا گیا کہ پھر نہ اس کی صبح ہوئی نہ میری۔ زندگی اس کا منہ تنگ رہ گئی اور موت میرا۔ سنتا ہوں کہ وقت نہیں ٹھہرتا ہے۔ لیکن میں نے سینہ کی جدائی کی وہ ایک شام یا تو بیکر کر اپنے سینے میں چھپالی ہے یا پھر وقت ٹھہر گیا ہے۔ لیکن میں نے زینو سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ بھلا ہر وہ بات جو دل کے زخموں کو کید کر رکھ دے کسی سے کیسے کہی جاسکتی ہے اور پھر آدمی کا دل دکھا ہوا ہو تو وہ دوسروں کے غم بھی اپنا لیتا ہے۔ لیکن میں تو اپنے دکھ درد کا موازنہ اس کے غم سے کرنے چلا تھا۔ یہ کسی خود غرضی ہے۔ کتنا جھوٹا ہی ہے۔ اس کے باوجود میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں بھی زندگی میں ایک بار صرف ایک بار پکار سکوں کہ "مینہ و شام ہو گئی ہے تم بھی گھر لوٹ آؤ" میں نے زینو کو قسمی دی۔ تم گھر چلی جاؤ۔ سجادے آجائے گا وہ کہاں نہیں جاسکتا۔ یہ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔

سجادے رات گئے گھر لوٹ آیا۔ زینو کا گھر میرے گھر کے برابر ہی تھا۔ مجھے رات ہی اس کے لوٹنے کی اطلاع مل گئی۔ جی چاہا سجادے سے دل کھول کر باتیں کر دوں۔ اس سے پوچھوں کہ اس کے پھوٹے سے دل پر اس نے تجربے سے کیا گزری۔ وہ گیا کیوں تھا اور آ کیوں گیا۔ وہ کیا بات لکھی جس نے اس کے دل سے اس کی بہنوں کی محبت چھین لی تھی۔ خون کے رشتے اٹوٹ ہوتے ہیں یا نہیں۔ اس کا مجھے علم نہیں۔ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ دل کے رشتے ضرور اٹوٹ ہوتے ہیں۔

صبح کو میں اس کے گھر گیا تو چاروں بہنوں میں گھرا ہوا دمٹھن سا بیٹھا تھا۔ سب کی سب

اسے نصیحت کر رہی تھیں۔ زینو کی باتوں سے برہنہ نمایاں تھی۔ زینو کا شوہر بھی بیچ بچہ ہیں
 سجادے کو دھمکا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اب اگر سجادے اسکول سے سیدھے گھر نہیں آئیگا
 تو پولیس میں اس کے خلاف رپورٹ لکھوا دی جائے گی۔ سجادے کی دوہنیں پھر آب دیدہ
 سی تھیں۔ پھر تجھے دیکھ کر جیسے ان کے آنسوؤں کو بہہ لینے کا سہارا مل گیا۔ اپنے
 مرحوم ماں باپ کو یاد کر کے وہ رو پڑیں۔ زینو نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اچھا ہی ہوا
 ہوا، امی اس دنیا سے اٹھ گئے۔ وہ سجادے کے یہ سب کروت دیکھتے تو اپنی موت نہ مانتے
 بھلا؟

میں نے آپے کہا نا۔ کہ سجادے تو بہت پیارا سا لڑکا ہے اس کے سر سے زمانے
 کی ہوا کے وہ بھونکے ابھی نہیں گزرے ہیں جو اسے اسکول سے اٹھا کر گلی کو چوں میں لے آتے
 لیکن وہ اپنی بہنوں کی اس اداسی سے ان کی برہنہ سے، غرض کہ ان کے ہر رد عمل سے اس
 طرح بے نیاز تھا۔ جیسے اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی، جو اس کی اپنی دانست میں اس کا
 سر جھکا سکتی تھی۔ مجھے سجادے کی یہ بے نیازی ہی تو کھل گئی۔ کچھ ایسا محسوس ہوا کہ اس کے
 سر سے زمانے کی ہوا کے وہ بھونکے گزر گئے ہیں۔ جو اسے اسکول سے اٹھا کر کوچوں میں لے جا رہے
 ہیں اور اب سجادے زینو کے بس کا روگ نہیں رہا ہے۔

زینو اپنی چھوٹی بہنوں اور سجادے کی صرف بہن ہی نہیں تھی۔ وہ تو ان کی ماں
 بھی تھی۔ اور باپ بھی۔ اس نے خود پڑھا، اپنی تعلیم ہی کے دوران میں ٹیوشن کر کے اتنا
 کمایا کہ سب بہنوں کی کفیل ہوئی۔ سجادے تو اس کا راجہ بھیا تھا۔ راجہ بھیا کو تو اس نے
 بڑھ چڑھ کر ہی چاہا۔ راجہ بھیا کے توبیں اللہ تبارک تھے۔ لیکن یہ ساری محبتیں، چادر کی
 گنجائش میں سمٹی ہوئی تھیں۔ محبت کی رعیت لا محمد و سہی۔ محبت کی دنیا کا اور پھر زینو

لیکن محبت کے اسکانامہ بڑے سکرانے سمیٹے ہوئے ہیں محبت کا کوئل پودا تو دل کے ٹوٹنے سے
 لے کر روٹی کے نہ ملنے کا، یکساں طور پر مر چکا جاتا ہے۔ — زینو کی چادریں محبت کی وسعتیں
 ست آئی تھیں۔ لیکن زمانے نے جوار اور گیہوں کے خوشے چادر کے دامن سے چرایا لے لے
 میں بھانپ گیا تھا کہ زینو کی یہی تھی دامن پیار کے نرم دنازک پودے کو غیر محسوس
 طور پر کھلانے کا باعث بن رہی تھی۔ نہ سجادے کا اس میں کوئی دوش تھا۔ نہ زینو کا۔ دونوں
 مجبور تھے۔ دونوں نردوش۔

میں نے جس طوفان کی آمد کد سے آہٹ پالی تھی، اب وہ طوفان تو میری نظروں کے سامنے تھا۔
 میں سن چکا تھا کہ زینو کے شوہر نے اسکول کی نوکری سے بھی زینو کو منع کر دیا تھا۔ اور
 اس نے یہ نوکری چھوڑ بھی دی تھی۔ — زینو کا شوہر چاہتا تھا کہ زینو جیسے اس کے گھر کی بہار
 بن کر آئی ہے تو یہ بہار اس کے اپنے گھر ہی کو چن در چن کر دے۔ زینو کے شوہر کا یہ مطالبہ
 غلطی بھی تھا جائز بھی اور زینو نے اپنے گھر کو جنت بنا دینے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ اب
 جب کہ ایک چاہنے والے شوہر کی بیوی بن گئی تھی۔ اب جب کہ وہ ایک گھر کی مالکن بن گئی تھی۔
 اب جب کہ وہ ایک بچے کی ماں بننے والی تھی۔ تو سجادے اس کا چہیتا ہونے کے باوجود بھی نہ
 اس کا حاصل زندگئی تھا۔ نہ مرکز نگاہ۔ — اب تو زینو محبت ہی محبت بن کر سب
 میں تقسیم ہوتی پھر رہی تھی۔

ایک دن تھا، سو اس میں، اس کا شوہر، اس کا گھر، اس کا ہونے والا بچہ، اس کی بہنیں،
 اس کا سجادے، سب سب اس طرح بے صبری سے داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔
 جیسے تنگ گلی میں کسی پھرے ہوئے جلوس کے بلوائی داخل ہوتے ہوں۔ — اور زینو ہر ایک
 کے آگے اپنا دل کھول کھول کر رکھ رہی تھی۔ اس نے اپنے دل کا دروازہ کھلی کھول دیا

تھا، دریکے بھی۔ جو دروازے سے آسکتا تھا، آ رہا تھا۔ جس کے بس میں نہ تھا۔ وہ درتکوں سے بچا پھلانگ رہا تھا۔ لیکن زمین کے شوہر نے جب یہ افزائش دیکھی تو سارے درتکے بند کر دیے اور دروازے پر پھر سے دار کی چٹخ بٹھ گئی۔

اس پہرہ بندی کا شدید رد عمل سب سے پہلے سجاد سے پرکھا ہوا تھا۔ سو ہوا بھی۔ وہ اپنے سر سے یہ کہہ کر اٹھایا جانے لگا کہ لاڑ صاحب سودا سلف لے آئے۔ وہ اپنے گھر کی طرف بھاگتا ہوا کہ آج گھر کا ایک اہم کام اس نے ادا کر دیا۔ غرضیکہ گھر کی صفائیاں کچھ ایسی پر چھائیاں سی چلنے پھرنے لگیں جنہیں پہلے کبھی سجاد نے نہیں دیکھا تھا۔

سجاد نے یہ کام کروا کر دیا۔ سجاد نے یہ کام کروا کر دیا۔ اسکول میں پڑھتے ہوئے کوئی احسان نہیں کرتے ہوئے سجاد نے۔ اپنی عمر کو دیکھو۔ اس عمر میں تو آدمی اپنا بار خود اٹھاتا ہو۔ سجاد نے کام کوئی پھر کے لوگوں میں کسی کو نہیں دیکھا۔ جس نے اس عمر میں اپنا بار آپ اٹھایا ہو۔ اسکول سے لڑتے تو اطمینان سے غور و آفتاب تک کھیلے رہتے۔ سجاد نے ترس ترس کر رہ جاتا۔ صبح اسکول جانے سے پہلے وہ من لگا کر گھر کا کام کر دیتا۔ لیکن شام کو اس کا گھر نہ گھر کے کام ہی میں لگتا۔ کھینٹنے میں۔ اس کا بھوٹا سادل اپنے گھر میں رنگتی ہوئی ان پر چھائیوں سے خوف سا محسوس کرتا تھا جو اس کی اپنی سب سے قیمتی زمین باجی کو بھی جھٹی جھٹی سا بن رہی تھیں۔۔۔ دل کی دنیا پر اداسیاں چھا رہی ہوں تو دکھاوے کی جھوٹی رنگ اور بے جان تھکنے خود اپنے آپ ہی کھینٹ لگتے ہیں۔ خواہ انھیں کوئی پہچانے کہ وہ چھپانے۔۔۔ سجاد نے بھی اپنے بھولیلوں کے بھر مٹ میں کھینٹا کھینٹا اور اس ہو جاتا۔

ایک دن اس کے دل نے اس سے کہا۔ سجاد نے اپنا بار آپ اٹھا لو۔

اس نے دل کی بات مان لیتے ہیں پس ہمیشہ سے کام لیا — دل نے پھر کہا۔
سجادے اپنا بار آپ اٹھا لو۔

اور جب سجادے نے اپنا بار آپ اٹھا لیا تو کالونی کی ٹکڑ پر مجھے زینوں گئی —
چاہتا تو میں زینوں سے پوچھ بھی سکتا تھا کہ اندھیرے اجالے کے اس سنگم پر — پیپل کے گھنے
سیالوں کے نیچے، بھری شام کے وقت جہاں مہتی ہوئی ٹارکیوں کو سڑک کی مدھم روشنی، اجالنے
کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔ وہ اکیلی کیوں کھڑی ہے۔ اسے کس کا انتظار ہے۔

لیکن میں نے اس سے کوئی ایسی بات نہیں پوچھی — سجادے لوٹ آیا تو زینوں نے
مجھے خود بتایا کہ سجادے نے کسی ایرانی کے بڑے سے ہوٹل میں ملازمت کر لی ہے۔ اور
اب وہ اسکوئی سے سیدھا اسی ہوٹل کو جایا کرے گا۔ جہاں رات گئے ایک دوپہ تک اسے
کام کرنا ہے۔

زینو مجھ سے کہنے لگی — اب آپ ہی سمجھائیے نامتین بھائی سجادے کو — وہ
نوکتا ہے کہ نوکری چھوڑ دینے کے لیے میں جبر کر دل لگی تو وہ گھر ہی سے کہیں چلا جائے گا۔
اور زینو کی آنکھیں زمین میں آنسو بوسنے سے لیے تیار کھڑی تھیں۔

میں نے سجادے کو نظر بھر کر دیکھا — اس کے چہرے پر ارادے اور عزم کی سرخی
تھیں شفقت کی ایسی سرخیاں جو نمود و سحر کا پتہ دیتی ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ سجادے نے اندھیرے کی طرف
نہیں اچالے کی جانب قدم اٹھایا ہے، اور ایسے میں اسے نہیں روک سکتا ہوں نہ زینو۔
اور ہوا بھی یہی — میں اور نہ تو بار گئے تھے۔ سجادے کی جیت ہوئی ملتی — اور اس نے
وہی ملازمت جاری رکھی۔

لیکن اپنی منزل کی جانتے بڑھنے والا یہ تنہا اور اکیلا راہی سجادے بھی ایک شام کالونی

کے اسی موڑ پر ادا اس اور رول کھڑا مجھے نظر آیا۔ جہاں کبھی زینو اسی عالم میں کھڑی ملی تھی۔

میں اس کے پاس گیا۔ اس سے بہت قریب ہو کر میں نے اس سے پوچھا۔
 ”کیا بات ہے سجادے؟“

سجادے کی چپ نے مجھے اصرار کرنے پر مائل کیا۔ میں نے یہ اصرار اس سے پوچھا۔
 — کچھ بتاؤ بھی سجادے شاید میں کچھ کر سکوں۔

سجادے نے بتایا کہ آج ہوٹل کے کام سے پھٹی کا دن ہے لیکن کالونی کے لڑکے
 جن کا وہ کبھی بہت پیارا دوست تھا آج اس کے ساتھ کھیلنے سے گریز کر رہے ہیں۔
 اس نے بڑے درد پھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔

دیکھیے وہ سب مجھے ہوٹل کا چھوٹا پکار رہے ہیں میں نے تو اپنا بار آپ اٹھایا
 تھا۔ میں نے کوئی برائی تو نہیں کی تھی۔ لیکن وہ مجھ سے کھیلنا تک گوارا نہیں کرتے۔
 ان کے بڑوں نے انھیں منع کر دیا ہے۔ بتائیے تا اب میں کیا کروں۔ میں کہاں
 جاؤں۔ کئی سے کھیلوں۔

میرے بدن میں جیسے لاد کی ایک بوند بھی اس وقت نہیں تھی۔
 میرا ذہن جس پر ابھی اُلھی بکلی گریا ہے۔ یہ سوچ رہا ہے کہ میں سجادے کو کوئی جواب دوں۔
 لیکن کوئی جواب مجھے سمجھائی نہیں دے رہا ہے۔

آپ بجا بتائیے میں سجادے کو کیا جواب دوں؟ — وہ منتظر ہے۔
 میں اس کا علم کس طرح بانٹ لوں۔

سنگِ آستان

قلبِ شہر میں واقع اس عمارت کا ماضی بھی بڑا شاندار ہے۔ اور حال بھی۔
 پچھا لگ میں داخل ہوتے ہی بڑا حائل کے نیچوں بیچ بیضوی دھن کا بہت بڑا حوض ہو
 صبر کے درمیان ایک فوارہ ہے اور اپنے شفاف پانی اور رنگ برنگی ٹھیلوں کے لیے
 مشہور ہو گیا ہے۔ حوض کے اطراف نرم و نازک نمودارہ ہریالی پر کم سے کم سو
 کرسیاں بچھائی جاسکتی ہیں۔

اس کے بعد سیر ڑھیاں ہیں جو آپ کو عمارت کے دامن میں لے جاتی ہیں۔ دامنِ عمارت
 کا حصہ اور بھی زیادہ دل بھانے والا، اور بھی زیادہ پرکشش ہے۔ ہمارے کی ترائی کی طرح
 دامن کوہ میں جو رنگینیاں بکھری ہوئی ہیں وہ ساری رنگینیاں کچھ زیادہ ہی اہتمام سے
 اس بلند عمارت کے اطراف سمیٹی گئی ہیں جو سطح زمین سے بلندی پر واقع ہے۔

سیر ڑھیاں چڑھنے کے بعد یہی جانب تراشی ہوئی باڑھ کے جھبے بنے ہوئے ہیں

جو تعداد میں پانچ ہیں۔ ان کے مقابل رنگارنگ پھولوں کی چھوٹی چھوٹی کاریاں ہیں۔
 کاریوں کے اطراف سینٹ کے بنے ہوئے گئے ہیں اور پھر اسی ہریالی کا سلسلہ ہے جس کے درمیان میں
 سرو کے درخت ہیں۔ اس ہریالی کے دو حصوں کو بانس کے جال سے گھیرا گیا ہے اور یہ جال
 اس حد تک حسین ہیں کہ بانس کا ایسا دلکش طریقہ استعمال میں نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ ایک ہی
 گولائی کے تراشے ہوئے بانس ہر چھ انچ کے فاصلے پر زمین میں پیوست کر دیے گئے ہیں
 اور ان پر دھلتا ہوا رنگ اور پھلکتا ہوا سفیدہ اس طرح پھیرا گیا ہے کہ ایک بانس ہر ایک
 ایک بانس سفید اور سفید و سبز کا یہی سلسلہ ہریالی کی پشت پر پھیلا ہوا ہے۔

سیڑھیوں کے بائیں جانب چوتھے کے وسیع حصے سفید محدب چینی
 کافر ش ہے اور دوسرے نصف حصے پر بالکل سرخ چینی کا۔ آپ ایک نظر میں ان دونوں
 وسیع حصوں پر بکھری ہوئی بینت کی سفید اور سرخ کاریاں اور میزیں دیکھ سکتے ہیں۔
 جو نظروں کو بے اندازہ بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ سفید چینی کے وسیع حصے پر سرخ میزیں اور
 کاریاں اور سرخ چینی کے نصف حصے پر سفید میزیں اور کاریاں۔ ان دونوں سفید
 اور سرخ حصوں پر گوشہ ابلق اور گوشہ احم کی رنگ مہر کی تختیاں لپٹے کے خوبصورت
 سے اسٹینڈ پر لگی ہوئی ہیں جو بالترتیب سفید اور سرخ ہیں۔ لیکن اب انھیں ان ناموں سے
 کوئی نہیں پکارتا بلکہ یہ 'وہائٹ کارٹر' اور 'ریڈ کارٹر' کے نام سے مشہور ہے۔

'وہائٹ کارٹر' اور 'ریڈ کارٹر' کے دلدادہ لگاں — شام ہوتے ہی
 اپنے اپنے کارٹر تنہا لیتے ہیں لیکن جنھیں ہریالی پسند ہے ان میں بھی تفریق اس طرح ہے کہ
 وہ آگ جنھیں ہریالی اور سرو کے لمبے لمبے درخت پسند ہیں وہ سیڑھیاں چڑھ کر بنی پر بکھی
 ہوئی ہریالی پر بیٹھتے ہیں اور وہ لوگ جنھیں ہریالی پر فواروں کی رم جھم اور پلجورے لیتے

ہوئے پانی میں تھرکتی ہوئی پھلیاں پسند ہیں وہ بجلی ہریالی ہی پر بیٹھ رہتے ہیں۔

اس کے بعد شیشے لگے ہوئے بڑے بڑے 'اسپرنگ' کے دروازوں کو کھول کر آپ کو عمارت میں داخل ہونا پڑتا ہے آپ کے عمارتوں میں داخل ہونے کے بعد 'اسپرنگ' لگا شیشے کا دروازہ جیسے مسرت میں بھومتا رہتا ہے۔ عمارت میں داخل ہوتے ہی آپ کا پہلا قدم ایران کے اس قالین پر پڑتا ہے جس پر پاؤں رکھتے ہی آپ کے آدھے آدھے جوتے قالین میں چھپ جاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رنگا رنگ تازہ دفرحت بخش پھول فرش پر تہہ در تہہ بکھیر دیے گئے ہیں اور آپ انہیں روند کر گزر رہے ہیں شبہہ ہوتا ہے کہ روند ہوئے ان پھولوں میں یہ شگفتگی اور تازگی کس طرح ہے۔

یہ ایک بہت بڑا وسیع ہال ہے جس میں آپ کم کم روشنیوں اور مدھم مدھم روشنیوں کی مدد سے داخل ہوتے ہیں۔ بڑی رومانی فضا یہاں پیدا کی گئی ہے۔ روشنیوں کے اہتمام میں حالیہ ٹیکنک کو استعمال کیا گیا ہے کہ چھت کو حسین نقش و نگار سے مزین کر کے روشنیاں 'یٹوب' لائٹ کی مدد سے پھیلا دی گئی ہے، لیکن اس طرح کے چھت میں چھپی ہوئی 'یٹوب' لائٹیں نہیں بالکل نظر نہیں آتی ہیں۔ صرف روشنیاں بکھر جاتی ہیں وہ لمبی کم کم 'مدھم مدھم'۔ چھت کے بچوں بیچ جو حصہ ہے اس کے اطراف ستونوں میں گولے چھپا دیے گئے ہیں جو سلکتے ہیں تو چھت پر ٹکے ہوئے ستاروں، آسمانی ستاروں کی طرح جھلکاتے لگتے ہیں۔ ایسے میں ہال کے اندر پھیلی ہوئی دوسری روشنیاں یا تو گل کر دی جاتی ہیں یا کم کر دی جاتی ہیں تاکہ درمیانی حصے کا یہ حسن اور نکھر سکے اور ابھر سکے۔

قالین پر بکھرے ہوئے صوفے بڑے نرم اور بڑے دیدہ زیب ہیں جو دیواروں کی جانب پشت کر کے رکھے گئے ہیں اور جن کی سادگی ہی ان کا حسن ہے۔ ان کے آگے میزیں پڑی ہیں

ان کے آگے میزیں پڑی ہیں اور ان کے مقابل گدے کی نرم کرسیاں جن کی وضع دائرہ نما ہے۔
 شہر کے اس سب سے خوبصورت اور شاندار ریٹورال اور بار سے آفتاب احمد
 ایم۔ اے کا بڑا گھر تعلق ہے۔ اس عظیم عمارت کی بنیادیں زمین میں جتنی گہری ہیں، اتنی ہی
 آفتاب احمد کی زندگی میں پیوست ہو گئی ہیں۔ رکاسی، آفتاب احمد کی زندگی میں تیس سال
 قبل اپنی خواب گوں قضاؤں سمیت پھر اس طرح داخل ہو گئی تھی جیسے کوئی انجان دوشیزہ کھون
 کے راستے دل میں داخل ہوتی ہے۔ اس وقت آفتاب احمد تیس سال کا دبلا پتلا اور بچھریا
 ماصحت مند فوجوان تھا۔ کالج کی زندگی تھی، بے فکری کے دن تھے۔ اس کی زندگی دنیا کے وسیع
 کارخانے سے ابھی اس طرح وابستہ نہیں ہوئی تھی کہ اس کے تصوروں کی دنیا تسخیر ہو جاتی۔
 ابھی بری کتا ہیں پڑھنا، بحث کرنا، دوستوں کی محفلوں میں خوش ہونا اور انھیں خوش کرنا بس
 یہی باتیں حاصل زندگی تھیں۔

کالج کے ساتھیوں میں محروم سے آفتاب کی بہت گہری بھینتی تھی۔ ان کے ایک دست
 نے کسی امتحان میں کامیابی حاصل کی تو محروم اور آفتاب نے صاف صاف کہہ دیا کہ رکاسی
 میں دعوت ہوئی چاہیے۔ رکاسی میں دعوت ملے ہوئی۔ تینوں مل کر دھڑکتے دل سے
 رکاسی پہنچے۔ جذبہ شوق کی فرادانی۔۔۔ اور تازہ تجربوں کے اشتیاق نے لگوں
 میں خون کی روانی کو خود ہی تیز کر دیا تھا۔ اس پر کبھی بھاپ بیر کا آرڈر دیا گیا۔ ان دنوں
 ’بکس‘ بیر کی قیمت دس، بارہ آنے فی بوتل تھی۔ بیر اتین بوتل بیر لے آیا تو دیکھتے ہی ان
 تینوں دوستوں کے ہوش بجا نہ رہے۔

تینوں نے ایک دوسرے کو گھنٹیوں سے دیکھا، نظروں نظروں میں باتیں ہوتیں اور دو
 بوتل واپس کرنے کا حکم فوری دے دیا گیا۔ بیرا مسکرانے لگا۔ وہ تارک گیا تھا کہ اس کو چہ میں پہنچا

ان فوجیوں نے قدم رکھا ہے اور سمجھ رہے ہیں کہ ایک بوتل بیرتینوں پر اتنا اثر کرے گی کہ کھجوتے کھجوتے بدست ٹوٹیں گے۔

بیرا کو سکراتا ہوا دیکھ کر تینوں مسکرانے لگے جیسے اس کی سکر اہٹ میں ان کی اپنی سکر اہٹ بھی چھپی ہوئی تھی۔ جب بیرتینوں گلاسوں میں تقسیم کر کے پیرا چلا گیا تو ان لوگوں نے اپنے جام اٹھا کر ٹکرائے اور ادھر ادھر دیکھ کر ہر ایک نے چمکی لی۔

”یارسہ تو کچھ عجیب کوڑی کیسلی سی ہے“ آفتاب احمد نے کہا۔ دوسروں نے منہ بنا کر گویا اس بات کی تصدیق اور تائید کی۔ لیکن اب کیا کیا جاسکتا تھا۔ مزہ تو اب ان لوگوں نے چکھ لیا تھا جو بڑا ناپسندیدہ ثابت ہوا۔ اب بے دے کر اس کا اثر دیکھنا تھا۔ بیسویں تیوں کر کے اپنے گلاس خالی کیے لیکن انھیں اپنی کیفیت میں کوئی تبدیلی محسوس نہ ہوئی۔ اس نئے تجربے کو اتنا بے اثر اور فضول مان لینے کے لیے ان کا ہی نہ چاہتا تھا۔ پی پی تھی تو ان کا تقاضا تھا کہ کچھ محسوس بھی کریں لوگ تو کسی کسی باتیں کرتے تھے۔ تینوں نے مشورہ کیا کہ اب سیدھے سیدھے کھانے کے کچھ اچھی چیزیں منگوائی چاہیے اور بس۔

میزبان دوست نے بیرا کو پکارا تو محروم نے کہا، ”آواز میں بڑا لویا آگیا ہے، شاید یہ اسی کا اثر ہے“ آفتاب احمد نے کہا کہ ”جراثیم زیادہ روشن معلوم ہو رہے ہیں اور شاید زیادہ گہرے“ پھر تینوں مل کر ہنسنے رہے۔ معلوم تو کیا خاک ہو رہا تھا، بس تینوں کی یہ خواہش تھی کہ ایسی کوئی بات ہوتی جو انھوں نے سنی تھی۔

پر تکلف کھانا کھانے کے بعد جب ان تینوں دوستوں نے رکاسی کو چھوڑا تو آفتاب احمد دل ہی دل میں رکاسی کا ہونچکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ رکاسی نہیں تھی جس کی مشہور کمی دھوا کی تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں۔ تیس سال پہلے کے رکاسی میں بیضوی بڑا حوض تھا، لیکن وہ خشک

بڑا رہتا تھا اور اس کے اطراف ہریالی کی بجائے کانٹے دار لوتھنے کے تار تھے جو اس کو مخصوص کیے ہوئے تھے۔ سیڑھیاں چڑھ کر بندی پر پہنچنے کے بعد سیدھی جانب سرسبز باڑھ کے حجرے تھے جس کی باڑھ کو ہیاں تراشا تک نہیں جاتا تھا۔ سرد کے سایوں والی ہریالی کی بجائے بس ایک چبوترانا کھلی ہوئی زمین تھی اور بائیں جانب بھی نہ گوشہ ابلق کھانا گوشہ انہر جو بعد میں ڈبائٹ کارنر، اور ریڈ کارنر کے نام سے مشہور ہوا بلکہ ایک مسطح بڑا سا چبوترہ جس کے اطراف ہری باڑھ لگی ہوئی تھی اور جس پر کرسیاں بچھ رہتیں۔ تین سال پہلے رکاسی کی عمارت میں داخل ہونے پر نہ آپکے پیچھے اسپرنگ کے دروازے درختی سے بھروسے نہ آپکے پیچلوں کو روکنے کا احساس کسی قانون پر پیر رکھنے سے ہوتا تھا، نہ بڑے ہال کی وہ کم کم اور مدھم مدھم روشنیاں تھیں، نہ چھت کے وہ نقش و نگار تھے، نہ رنگوں کے امتزاج سے یہ سماں بنتا تھا، نہ ستارے آسمان سے اتر کر چھت پر آتے تھے۔ بس ایک سیدھا سا داہنت بڑا ہال تھا جس میں لکڑی کے ادٹوں سے علاحدہ علاحدہ آرضی کمرے بنا دیے گئے تھے جن میں روغن چڑھی ہوئی بینت کی کرسیاں اور میزیں بڑی تھیں۔ ہال کا ایک پورا نصف حصہ جو بڑے بڑے ستونوں کے دس طرف تھا رکاسی کے منتظمین کے قبضے و تصرف میں تھا۔

ہال کو دو حصوں میں اس طرح تقسیم کیا گیا تھا کہ اس کے بچوں بچ جو بڑے بڑے ستون تھے ان سے ملحق الماریاں رکھ دی گئی تھیں جن میں مختلف قسموں کی مشربوں کی بوتلیں، گوشت، مچھلی بنانے اور جام کے ٹن، پنیر اور مکھن جانے اور کافی کے پیکٹ اور مختلف کھانے کی چیزیں دھری رہتیں۔ یہ الماریاں ستونوں کی مدد سے گویا ہال کو دو حصوں میں تقسیم کرتیں اس طرح پچھلا حصہ رکاسی کے منتظمین کے لیے مختص ہوتا اور یہی رکاسی کے تقریباً تیس سال تک کمرہ بیڑا اسی حالت میں آفتاب احمد کا رفیق رہا ہے۔

لیکن آج رکاسی کا یہی بل اپنی حیثیت بدل کر کیا سے کیا معلوم ہونے لگا ہے۔ نہ وہ لکڑی کی ادٹ ہیں نہ وہ روغن چڑھی کرسیاں، نہ وہ بڑی بڑی الماریاں منتقلیں کو گا کہوں سے علاحدہ کرتی تھیں اور جو راستے گئے پرانے اور خاص خاص گا کہوں کے لئے جاوینا نہ بنتی تھیں۔ اس طرح کہ بازار کا وقت ختم ہو جائے پھر بھی منتقلیں کسی کو جس پر وہ مہربان رہتے، ان الماریوں کے پیچھے چھپا کر شراب دیتے تھے۔

آفتاب احمد کی کتنی ہی یادیں اس حال سے وابستہ تھیں، جس نے آج چولا بدل لیا ہے اس کا ماضی جیسے اس بل میں بلکہ رکاسی کے چپے چپے میں آج تک کوئی چیز تلاش کرتا پھر تاپے: لیکن آج رکاسی تو اس طرح سچ و سچ کہ اس قدر رعنائیاں اپنے دامن میں سمیٹ کر آفتاب احمد کے سامنے کھڑی ہے کہ اس کی آنکھیں چونڈھیا گئی ہیں، وہ بگبگ بھپک بھپک کر ان نئے اجالوں سے کھو کو مایوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

آپ جان چکے ہیں کہ آفتاب احمد آج سے تیس سال قبل پہلی بار رکاسی سے متعارف ہوا تھا جب کہ اس کے ایک دوست سے کامیابی کی خوشی میں اس نے پارٹی، ڈی جی، جائزہ کول اس کو رکاسی کی وہ فضا میں پسند آئیں جن میں آدمی اپنی زندگی بھر کی تنہائیوں کو ساتھ لا کر بھی بہل جاتا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ رکاسی کی باڑھ میں سسکتی ہوئی ہوا کے بھونکوں میں ایک ایسی کیفیت ہے جو آدمی کے سینے میں دھیمی دھیمی آہنج بھی لگاتی ہے، اس کو ہوا بھی دیتی ہے۔ اتنی بڑی عمارت کے اطراف پھیلے ہوئے اتنے وسیع احاطے میں کہیں کیس دو چار گولے اس طرح جلتے تھے جیسے افسانی دکھ درد کو نگار کرنا چاہتے ہوں۔ وہ کھنی کھنیا میں چبوترہوں پر بکھری ہوئی روغن کی سیوں پر افسانوں کے دھڑکتے ہوئے دل اور ان دلوں کی مختلف کیفیت کو حاضر کرتے ہوئے بہرے بالکل عیاں اور عریاں ہو کر ایک دوسرے کے مقابل ہو جاتے اگر یہ روشنیاں تیز ہوں۔

رکاسی کی فضاؤں پر ایسی بولی ہوئی خاموشی، ایک ایسی آباد و رانی کا گمان ہوتا جس کا تعلق صرف عالم محسوسات سے ہوتا ہے اور آفتاب احمد اس عالم محسوسات کا دلدادہ اور رسیا تھا جو اس کو رکاسی کے ماحول میں مل گیا تھا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن چپکے سے دوستوں کی محفلوں سے اٹھ کر رکاسی چلا آتا۔ کبھی کسی گوشے میں بیٹھ کر، لیکن اسکو اش، پیتا۔ کبھی ٹھنڈی کافی، کبھی گرم چائے، کبھی اس کی جیب بجا زت دیتی تو وہ رات کا کھانا میز پر رکھ لیتا اور گھنٹوں بیٹھا یہاں کے پرسوں ماحول سے سکون پاتا۔

پھر وہ قریب قریب روز آنے لگا، میس، اور کاؤنٹر پر بیٹھ ہوئے منجر کے لیے اب اس کا بھرہ مایوس سا ہو گیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی شخصیت ہی ان سب کے لیے مایوس ہو چلی تھی۔

اپنی شاموں کی خوشیاں، اپنی شاموں کی اداسیاں، اپنی شاموں کا حاصل، اپنے ساتھ لیے وہ برابر رکاسی پہنچ جاتا۔ رکاسی سے اس کی یگانگت بڑھتے بڑھتے ایک بے نام کی ضرورت میں تبدیل ہو گئی۔ پھر یہی ضرورت لگاؤ اور انس تک جا پہنچی اور ہوتے ہوتے آفتاب احمد کی زندگی میں رکاسی اس طرح داخل ہوئی کہ اس کی شاموں کی ساتھ بن گئی۔ دن ہفتوں میں تبدیل ہوئے، مہینے برسوں میں۔ "انٹر میجیٹ" کا طالب علم اب آفتاب احمد ایم۔ اے ہو چکا تھا۔ کتنی ہی نئی دوستیاں رکاسی کے پرسوں ماحول میں پروان چڑھیں کتنی ہی پرانی محفلیں اور دوستیاں رکاسی سے اس کے تعلق خاطر کے سبب آفتاب احمد کو چھل چکیں۔ اس کے زمانہ طالب علمی کے دو چار دوست اس کو رکاسی میں پھرے۔ دوستوں کی تحریک ہوئی لیکن اس کے دھاکے کے بن بھن کچھ اور استوار نہ ہو سکے۔ کوئی نوکری پا کر صلے پر چلا گیا، کوئی شادی کر کے گھر کا ہو رہا۔ آفتاب احمد جانے والوں کی بادل میں چھپا کر

آہستہ آہستہ پھرتا رہا اور آنے والوں کے لیے دوستی کا ہاتھ بڑھاتا رہا، یہاں تک کہ پوری ایک نسل جو اس کی ساتھی تھی اس کے سامنے بوڑھی ہو گئی۔ اس نے عمر کے فرق کو محسوس کیے بغیر نئی نسل کے نوجوانوں کو دوست بنا کر انھیں نوازا اور جو کچھ انکا دکا اس کے اپنے ہم عمر، اسکی اپنی زندگی کی راہوں پر کہیں کہیں مل جاتے تھے ان سے دوستی نبھائی۔ وہ نہ کسی کی قبر پر دیا جلانے کا قائل تھا نہ کسی عرس میں ردھنیاں گل کرتے کا۔ غم ملتے تو وہ انھیں پیار کر لیتا خوشیاں ملتیں تو وہ انھیں چوم کر چھوڑ دیتا۔ نہ دے اس کے دل میں جاگزیں ہوتے نہ یہ اس کے دل میں رنج میں جاتیں۔ جو مل گیا سو اس کا، جو چھوٹ گیا سو اس کا نہیں۔ پانے اور کھونے کے درمیان اس نے ایک ایسا سمجھوتہ کر رکھا تھا جو نہ غم کو غم بننے دیتا، نہ خوشی کو خوشی وہ تو زندگی کی کڑی دھوپ میں ننگے سر چل پڑا تھا۔ سائے دار درخت ملا تو سستایا، بگے اٹھ یا چکر چلے تو کمر اکر نکل جانے کی کوشش میں کھلبلیں گیا۔ ٹھنڈی پچھاں میں گھڑی دو گھڑی بھی دم لینا بھی گوارا، جھیل میدان میں لو کے پھیرے بھی منظور۔

آفتاب احمد ایم۔ اے کی متوازن شخصیت اس کے تحمل، اس کی بردباری اور سنجیدگی کے باعث بڑی سمجھ ہو گئی ہے۔ بائیس چوبیس سال کے نوجوان دوست اس کو آفتاب بھائی کہہ کر اس کی دوستی پر فخر کرتے ہیں اور اس کے ہم عمر ساتھی پران یا دوں کو تازہ کرنے کے لیے اس کو گالی دے کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اس کو آفتاب بھائی میں بھی سلوک ملتا ہو آفتاب احمد ایم۔ اے میں بھی گالی میں بھی۔ رکاسی میں بیٹھ کر اس نے ققنوں کا سوگت بھی مسکراہٹوں سے کیا، مسکراہٹوں کی پذیرائی بھی ہلکی ہلکی مسکراتے سے کی ہے۔

اس کی شخصیت کا مزاج رکاسی کی آباد دیرانی میں شاید اس لیے بارپا تا ہے کہ اس کو رکاسی کی بیرونی دنیا اپنی اندرونی دنیا کے عین مطابق محسوس ہوتی ہے۔

’میں اسکاوش‘ ٹھنڈی کافی اور گرم چائے سے جب وہ بہن نہ رکھا تو اس نے دھکی کو
 آزمانا چاہا۔ دھکی نے اس کو تھپک کر فوریاں بھی دیں، بھجھوڑ کر بیدار بھی کیا۔ دھکی نے اس کے
 قدم سے قدم ملا کر زندگی کی کڑی راہوں میں اس کا ساتھ دیا۔ آنکھیں بند کر کے جاگتے رہے
 اور آنکھیں کھول کر سو رہنے کا گروہ جانتا تھا۔ رکاسی اس کی تنہائیوں میں راز و مال نہیں،
 اس کی شاموں کی آئین۔ وہ رکاسی کے ایک ایک گوشے میں گھنٹوں گزار دیتا۔ تیس سال کے
 اس طویل عرصے میں رکاسی کا ایک ایک چپے اس کی تنہائیوں کا ساتھی رہا ہے۔ وہ اپنی تنہائیوں
 و امین دل میں سمیٹ کر رکاسی کے کسی گوشے میں ان کی اک انجمن بجا لینے کے لیے آتا۔ دھکی اس
 انجمن کو سنبھالنے میں مدد دیتی۔ لیکن جب اس کے دوست احباب اس کو تنہا بیٹھا ہوا پا کر اس کے
 ٹیبل پر پودہ رکھ جلتے تو اس انجمن سے اٹھ کر ان میں آملتا، بالکل اس طرح جیسے انھیں کا منتظر تھا۔
 آفتاب احمد ایم۔ اے نے گزنی ٹھمدے داری کے باوجود شادی سے اس لیے گریز
 کیا کہ اس کو کسی بھی انداز کی پابندیاں گوارا نہ تھیں۔ اس کی ریفیقہ حیات تھی تو دن کو اس
 کا اپنا کتب خانہ اور شام اور شب کو رکاسی اور رات گئے بستر کی ٹنگنیں۔ دوست احباب
 اس کو ’انسائیکلو پیڈیا‘ کے نام سے بھی پکارتے تھے۔ کسی بھی موضوع پر کسی بھی کتاب کا حوالہ
 آپ کر اس سے مل سکتا تھا۔

جب عمر کا ذکر میں حصہ اس نے اپنی کتابوں، دھکی کی بوتلوں اور رکاسی کی آباد ویرانوں
 کی نذر کر دیا تو پھر اس نے کسی تیسرے ہمسفر کی تلاش کو قابل اطمینان نہ سمجھا اور اسی لیے صرف
 اس نے شادی نہیں کی بلکہ بہت جلد ہی نوکری بھی چھوڑ دی۔

کتب خانہ سے نکل کر وہ ’نیو‘ کرتا، جی بھر کر ٹھنڈے پانی سے نہاتا۔ بڑے سیتھے سے
 کچھ سے سمجھتے کپڑے پہن کر پہلی قدمی کرتا، ’میں اسٹینڈنگ ٹیبل پر بیٹھ جاتا اور سات ساڑھے سات

تک گھومتا پھرتا، رکاسی کے احاطے میں داخل ہو جاتا۔

رکاسی، اس کے پیرے، اس کا بیٹھرا، جیسے سب کے سب اس کے منتظر رہتے۔ سکر اہٹوں کے تبادلے اور پیام اور سلام کے بعد وہ کسی گوشہ عافیت میں پناہ لیتا اور رکاسی اپنی ہلکی ہلکی روشنیوں کے ساتھ اس طرح نیم خوابیدہ عالم میں بیدار ہوتی جیسے اپنے احاطے میں بکھر ہوئے انسانی چہروں پر مدھم روشنیوں کا غارہ چڑھا کر جیلا بخش رہی ہو۔

کبھی کوئی پرانا ساتھی یا جانی دوست اسے مل جاتا اور ایسے میں کسی اندرونی شدید جذبے کے تحت دونوں ہی دیر تک بیٹھے جام پر جام چڑھاتے رہتے اور اس کے باوجود بھی یہ راز نہ ہوتی اور رکاسی کے مدھم جامے آہستہ آہستہ اندھیروں کی آغوش میں سو جاتے، تو وہ اس کو لے کر ان بڑی بڑی الماریوں کے پیچھے بیٹھ کر پاس چلا جاتا، جہاں دوسرے لگا ہوں سے چھپا کر اسے مزید شراب دی جاتی۔

کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ بیٹھرا الماریوں کی کنجیاں اس کے حوالے کر کے چلا جاتا اور وہ بیٹھنے کے بعد بل کی رقم خالی گلاس کے ساتھ الماری میں رکھ کر چابیاں اس مخصوص مقام پر رکھ جاتا جو صرف اس کو اور بیٹھرا کو ہی معلوم رہتا۔

رکاسی کی یہ خصوصیات، رکاسی کی یہ اپنائیت، رکاسی کی یہ محبتیں اس کی زندگی کا حوالہ بن گئی تھیں۔

اگر کوئی تھا جس کو آفتاب احمد ایم۔ اے نے چاہا جس کی دلداری کی، جس کے لیے اپنے معاملات میں فرق آنے کو بھی گوارا کیا، تو وہ تھی اس کی ماں۔ اور جب اس کی ماں شدید بیمار ہوئی تو آفتاب احمد جس نے ہوش سبھلنے کے بعد سب سے بچا اس سال کی عمر تک نہ کسی کی تیار دار کی تھی نہ کسی کا دن رات اس طرح سنیاں کیا تھا کہ بس ایک ہی شخصیت مرکز توجہ ہو جائے،

بالکل ہراساں پریشان اور خائف ہو گیا۔ آج تک اس ماں نے ہی اس کے ناز اٹھائے تھے۔ آج تک تو اس کے گھر پر اس کے قدموں کی چاب کا کوئی منتظر تھا تو اس کی ماں تھی اس کے دروازہ کھٹکھٹانے کے خاص انداز پر کوئی کبھی نیند سے چونک کر بیدار ہوتا تو وہ اس کی ماں ہوتی۔ اور اس کی ماں کا کوئی بندہ مقابل نہ تھا، کوئی حریف نہ تھا جو آفتاب احمد اپنی محبت اپنی بیوی، اپنے بچوں اور اپنی ماں میں تقسیم کرتا۔ اس نے آفتاب احمد کو ٹوٹ کر چایا تو آفتاب احمد نے بھی بلا شرکتِ غیرے اپنی محبتیں اس کو سونپ دیں۔

عمر سب سے بڑی بیماری تھی۔ آفتاب احمد جان گیا تھا کہ اب یہ آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گی جو رات گئے اس کی آہٹ کی منتظر رہتی ہیں۔ اس نے تندہی سے ماں کی تیمارداری اور خدمت کی تقریباً دو ماہ تک وہ بالکل گھر سے باہر نہ نکلا۔ ہر شام اپنے معمول کے مطابق وہ گھر ہی پر پی لیا کرتا۔ ہفتے بھر تک جب وہ باہر نظر نہ آیا تو کچھ دوست خیر خیریت پوچھنے گھر پہلے آئے کسی نے بتایا کہ رکاسی بند ہو چکا ہے اور کورٹ میں ایک زمانے سے عمارت کے مالک اور رکاسی دبا، کے منتظین کے درمیان جو قصہ تھا وہ مالک عمارت کے حق میں فیصلہ ہو چکا ہے۔ یہ خبر آفتاب احمد کے لیے کوئی معمولی خبر نہیں تھی۔ تیس سال کے کسی ایسے ساتھی کی موت جو زندگی کا بوجھ اٹھانے میں برابر کا حصہ ادا کر رہا ہو اور خوشیوں اور مسرتوں کے حصول میں بھی کوئی معمولی سا غم نہ تھا۔ ہاتھ تھکاتے کیے لیے جسے اس نے بکارا رکاسی رکاسی، لیکن رکاسی اس کی راہ تک کر مر گئی تھی۔ اس نے دبی زبان سے کہا، ”اب کیا ہوگا یا ر“ اس کے دوست نے آفتاب احمد کی بہت دیر سے آتی ہوئی آواز سنی۔

اس نے انکشات کیا کہ رکاسی پھر سے کھٹنے والی ہے۔ دوسرے لوگ جو اس عمارت کو کرائے پر لے رہے ہیں وہ رکاسی کے نام کی ”رائیٹی“ ادا کر کے پھر بارہ اور رستوراں بھی

کھولنے والے ہیں اور عام خیال یہ بھی ہے کہ رکاسی اس بار بڑی سچ دھج سے کھلے گی۔

دوست جلد چلے تو آفتاب احمد نے گھڑی دیکھ کر اپنی ماں کو داد دی اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے — اسے بہلانا چاہا۔ لیکن جب ماں نے کراہتے ہوئے اس سے پوچھا، ”کیوں آنے لگے تو تو کچھ ادا اس ادا اس سے بیٹا، میری دیکھوئی کرتے ہنستا ہے تو ہنسی ترے ہونٹوں پر کھلتی نہیں ہے۔ میں اچھی ہو جاؤں گی، پتلے“ تو آفتاب احمد اٹھتے ہوئے آتسو چھپا کر حجب اپنی ماں کے بستر کے پاس سے اٹھ آیا تو وہ اس کو یہ بھی نہ بتا سکا، ”ماں، رکاسی سر چمکی ہے اور میں اسے آخری بار دیکھ چکی ہوں۔“

آفتاب احمد نے آج وقت سے پہلے ہی بوتل کھول کر حجب دسکی گلاس میں انڈیلی تو ایک آتسو بھی اس میں بنا ملا۔

ماں کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ اس سے جو کچھ بن پڑا کیا۔ اپنی جانب سے کوئی کسر اٹھانہ لکھی۔ دو ماہ کی طویل علالت کے بعد اس کی ماں کے پاس سوائے سانس کچھ اور باقی نہ تھا اسی اثنا وہیں آفتاب احمد نے سنا کہ رکاسی پھر کھل گئی ہے۔ اس بار تو اس کی سچ دھج نرالی ہے، اس کا روپ رنگ انوکھا ہے اس کی جمال آرائی اور حشر سامانی دیدنی ہے۔ اس خبر نے بھی کچھ عجیب سی کیفیت آفتاب احمد پر طاری کر دی اس نے رکاسی کی زندگی کی خبر سنی تو اس وقت ٹھنی حجب کہ اس کی ماں آخری سانس لے رہی تھی۔ وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ غم اور خوشی کی اس ٹی جلی سرحد پر وہ چھپے ہوئے آنسوؤں کا سارہ دے یا پھپھی ہوئی مسکراہٹوں کا۔ آخر اس کی ماں مر گئی آفتاب احمد نے بڑے تحمل سے اس کو دفن یا ختم قرآن کے لیے حافظ مقرر کیے اور گھر لوٹ کر ماں کے خالی بستر پر اس کے تکیوں میں منہ چھپا کر لیٹا رہا۔ پھر بہت ہی دل دہی سے اس کی قبر اپنی نگرانی میں پختہ بنوائی۔

آج ماں گھر میں نہ تھی تو جیسے اداسیاں سارے میں پڑاؤ ڈال چکی تھیں۔ وہی کتب خانہ، وہی کتابیں، وہی درد و دوار، وہی اس کا کرد، وہی پھت، وہی انگلی۔ سب چیزیں جیوں کی تیوں تھیں، صرف ماں کا بستر خالی تھا تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہر شے میں کچھ کمی ہو گئی ہے اداسیاں گھر میں کچھ اس طرح آئی تھیں کہ صحن کی نرم دھوپ پر بھی یرقان زدہ مریض کی چادر کا گمان ہوتا تھا۔ ایک عمر کی رفیق اپنی تنہائیوں کو اس غمزدہ فضا میں اپنے سینے میں چھپائے ہوئے وہ کئی بار رکھ سکی کو یاد کرتا۔ وہ سکی سے بھرے ہوئے جام میں اپنے چہرے کا عکس دیکھ کر اسے اپنی ہستی بڑی کھوکھلی سی معلوم ہوئی۔

اپنے وجود کے بارے میں اس کے اپنے ذہن میں کئی سوال ابھرنے لگتے۔ زندگی کیا ہے، کیوں ہے اور اس طویل سفر میں میہری اپنی کوئی منزل بھی ہے یا سفر ہی سب کچھ ہے۔ اس نے اس سوال کا جواب رکاسی سے پوچھنا چاہا، رکاسی جو اس کی تیس سالہ تنہائی پسند زندگی کی راز داں ہے۔ مہینوں بعد رکاسی کی فضاؤں میں سانس لینے کے تصور ہی سے اس نے محسوس کیا جیسے کوئی اسے تسلی دے رہا ہو، کوئی اس کے زخموں پر پچھائے رکھ رہا ہو۔

وہ شام ہوتے ہوتے رکاسی پہنچ گیا، خشک حوض جو اس کی زندگی کی طرح اب اتنا بدل گیا تھا کہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ لوہے کے خاردار تار ٹوٹ کر نرم اور ٹھنڈی ہریالی بن گئے تھے۔ بالائی حصے پر پہنچ کر وہ ایک ایک گوشے میں اس رکاسی کو ڈھونڈتا پھر اس کی اندرونی کیفیت کا بیرونی عکس رہی تھی۔ لوگ اس کو سرد کے لیے لیے سایوں میں ہریالی پر بکھری ہوئی کرسیوں پر خشکیاں کرتے نظر آتے دوسری جانب کا وسیع بالائی حصہ جو خود رنگھاس کے بکھرے ہوئے برے دھواں

کے باعث ایک ایسا قدرتی منظر پیش کرتا تھا جس کو انسانی ہاتھوں نے سمجھا نہیں ہو سکتا۔
 ڈوائس کا رز، اور ریڈ کارنر، میں بدل گیا تھا۔ اب نہ وہ ماحول تھا جہاں اپنی
 تنہائیوں کی محفل سجانے کا امکان نکل آتا۔ اب نہ بارٹھ میں وہ سسکتی ہوئی ہوائیں
 تھیں جو آدمی کے سینے میں دھیمی دھیمی آہنچ بھی لگاتی تھیں۔ اب بجلی کے گولے اُس
 طرح نہ جلتے تھے کہ انسانی دکھ درد کو اپنی کم کم روشنی چھپا لینا چاہتے ہوں۔ اب
 رکاسی کی فضاؤں میں نہ وہ بولتی ہوئی کسی خاموشی تھی نہ وہ آباد و رانی تھی جس سے
 آفتاب احمد درد رعبے مانوس تھا۔ وہ قالین پر بکھرے ہوئے بچے رنگین پھولوں کو
 روند کر جیب ہال کے بچو بیچ پوچھ گیا تو بالکل مبہوت سا اس طرح کھڑا کھڑا رہ گیا
 جیسے اپنی اس شریک حیات کو جو برقعے میں بھی بجاتی اور شرماتی تھی، ”ڈانس ہال“
 میں نیم برہنہ کسی کے ساتھ رقص کرتی ہوئی دیکھ رہا ہو۔ اس نے بلیکس چھپکا ئیں، سینک
 آتار کر آنکھیں ملیں، پھر شیشے صاف کر کے سینک چڑھائی۔ لیکن نہ رکاسی نے اسے پہچانا نہ
 اس نے رکاسی کو۔ دہاں تو ایک پہرہ بھی نہ تھا۔ وہ چپ۔ چاپ ہال کے باہر نکل گیا۔
 اس نے اچھٹی ہوئی نگاہیں، سرد کے لیے سایوں کے نیچے بھی ہوئی ہریالی پر ڈالی،
 پھر اسی سمت بڑھ کر ایک ایسے کچھ میں بیٹھ رہا جہاں کم سے کم نظریں اسے دیکھ پاتیں۔
 دیر تک بیٹھا وہ دھمکی پیتا رہا۔ اس کی آنکھیں رکاسی کو تلاش کرتی رہیں، اس کا جی
 چاہا وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر بارے رکاسی تم ڈانس ہال سے باہر نکل آؤ اور مجھے سینے سے
 لگا لو۔ میں تمہاری صورت کے لیے ترس گیا ہوں۔ میں وہ سب کچھ زندگی کے دست برد
 سے بچ کر آج بھی تمہارے لیے یہاں لے آیا ہوں، رکاسی، جو ہم دونوں کو شرمک تھا، لیکن تم
 بدل گئی ہو، تم جو میری تنہائیوں کی آغوش تھیں، تم جو میرے دکھ درد کا رشتہ تھیں۔

دیوانوں کی طرح چپے چپے کو تکتا ہوا گوشے گوشے میں کچھ ڈھونڈھتا ہوا وہ جب سڑھیا
 اترنے لگا تو اپنا بھلیگا ہوا رومال جیب میں رکھتے ہوئے اس نے سوچا — ماں مر گئی تھی
 زندگی سے کوئی شے کم ہو گئی تھی، لیکن رکاسی تو زندہ ہے۔۔۔۔ پھر وہ یہ چانی کیوں نہیں جانتی
 پھاٹک تک آ کر اس نے ایک نگہ پھر رکاسی پر ڈالی۔ رکاسی سے گریں پھوٹ رہی تھیں۔ اس
 نے بہ آواز بلند پوچھا، میں اب اپنی شاہیں، بے کر کہاں جاؤں؟ رکاسی، تم ہی بتاؤ؟ لیکن
 کچھ جواب نہ پایا کہ اپنی بقیہ زندگی کی طویل شام سینے سے لگائے وہ باہر نکل گیا۔

ماہنامہ کتاب کی

یادگار اشاعتیں

ہمیشہ زندہ رہیں گے

● افسانہ نمبر قیمت = ۶/ اس افسانے، ۲ ناولٹ، ۲ ڈرامے، ۴۰ مضامین اور ۲ فکر انگیز سمپوزیم، ۳۰ تصاویر صفحات ۴۳۴

● سالنامہ ۱۹۶۶ء قیمت = ۴/ اس یادگار نمبر میں ہندستان اور پاکستان کے صف اول کے فنکاروں کی تخلیقات کے علاوہ جدید شاعری پر ایک پر مغز سمپوزیم شامل ہے جس میں ہندوپاک کے سارے ہی اہم نقادوں اور شاعروں نے حصہ لیا ہے۔

● منتخب افسانہ نمبر قیمت = ۵ روپے۔ اردو افسانہ نگاروں نے ۱۹۶۲ء میں کم و بیش ۲ ہزار افسانے تخلیق کیے جن میں سے رام لعل اور عابد سہیل نے ۲۷ افسانے منتخب کیے۔

● نئی ہندی کہانی نمبر قیمت = 1/ اردو افسانے نے ہندی افسانے کو کس حد تک متاثر کیا ہے۔ اس کا اندازہ آپ اس نمبر سے لگا سکتے ہیں۔

● علی عباس حسینی نمبر قیمت = 2/ اس نمبر میں حسینی صاحب کی بہترین کہانیوں کے علاوہ ان کے فن اور زندگی پر متعدد مضامین شامل ہیں۔

● مراٹھی کہانی نمبر قیمت = اس نمبر میں مراٹھی کی ۲ نمایندہ کہانیوں کے علاوہ مراٹھی ادب پر ہم فکر انگیز مضامین شامل ہیں۔ مرقبہ: نو رپکار کے اس کارنامہ کو علمی اڈا دلی حلقوں میں بے حد سراہا گیا ہے۔

ماہنامہ کتاب کی یادگار کیٹ۔ لکھنؤ